۱ آبِ زَم زَم

مکہ معظّمہ کی مسجد الحرام سے صرف ۲۰ میٹر کے فاصلے پر جنوب مشرق کی جانب حجرِ اسود کی سیدھ میں ایک کنواں واقع ہے جس کو بیرِ زَم زَم کہتے ہیں۔ بیر عربی میں کنویں کو کہتے ہیں۔ یہ کنواں کعبہ شریف سے بھی قدیم ہے اور اس کی گہرائی کے بارے میں پہلے قیاس تھا کہ ۱۴۰ فٹ ہے لیکن حالیہ پیمائش پر یہ ۲۰۷ فٹ گہرا پایا گیا۔ ممکن ہے پانی کی مسلسل نکاسی کی وجہ سے یہ نیچا ہو گیا ہو۔ مسلمانوں کے نزدیک اس کا پانی متبرّک ہے۔ نبیِ اکرم خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے اِسے ہمیشہ قبلہ رُو اور کھڑے ہو کر پیا اور ایک خصوصی دعا فرمائی:

"اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، ایک ایسے علم کا جو فائدہ دینے والا ہو اور ایسے رزق کا جو مجھے کھلے دل سے عطا کیا جائے اور مجھے تمام بیماریوں سے شفا مرحمت فرما!"

آج سے ہزاروں سال پہلے کی بات ہے کہ آج کل جہاں مکّہ مکرمہ کا متبرّک شہر آباد ہے۔ وہاں ریت اور جھلسی ہوئی پہاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دُور دُور تک کسی جاندار کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسی زمانے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی حضرت ہاجرہ کو ان کے نومولود بچّے (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کے ہمراہ مکّے کی بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ آئیں۔ جب یہ قافلہ منزلِ مقصود پر پہنچا تو اس صابر و شاکر خاتون نے اپنے مجازی خدا سے صرف ایک بات پوچھی: "کیا ہمارا یہاں آنا اور رہنا اللہ کے حکم کی تعمیل میں ہے؟" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اثبات میں جواب دیا تو وہ مطمئن ہو گئیں کہ اب ان کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ جو اُن کو وہاں لایا ہے، وہی ان کی خبر گیری بھی کرے گا۔

ماں اپنے ننّھے شیر خوار کو لیے ایک پہاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ سورج بلند ہوتا گیا۔ دھوپ کی تیزی بڑھتی گئی۔ زمین تپ گئی۔ گرم لُو کے تھپیڑے آنے لگے۔ پانی کی چھاگل خشک ہونے لگی اور ذرا دیر میں سوکھ گئی۔ ماں بچّے کے ہونٹ سوکھے، پھر زبان خشک ہوئی۔ ماں گھبرائی۔ ننّھا سسکنے لگا۔ ماں کے ہوش اڑ گئے۔ اپنی پیاس بھول گئی۔ بچّے کی حالت دیکھ کر تڑپی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریت کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اوپر دیکھا آسمان کو دُور پایا۔ نیچے دیکھا زمین کو تنور پایا۔ ان حالات میں حضرت ہاجرہ بے ساختہ پکاریں:

"میرے رب! پانی پانی! ایک گھونٹ، ایک قطرہ۔ میرے لیے نہیں، میرے بچّے کے لیے۔ شیر خوار اسماعیل کے لیے! اے ابراہیم علیہ السلام کے خدا! اس جنگل میں، اس بیابان میں، اس ریگستان میں، آگ کو گلستاں بنانے والے! اس آگ کے دریا میں پانی کا چشمہ بہا! میرے ننّھے کو پانی کا ایک قطرہ عطا فرما! اللہ میاں! مجھے اپنی جان کی پروا نہیں، اس ننّھی جان پر کرم فرما!"

آخر کار بچّے کی حالت نہایت نازک ہو گئی۔ حضرت ہاجرہ پریشانی کے عالم میں کبھی صفا کی پہاڑی پر جا کر دیکھتیں اور کبھی مروہ پہاڑی پر چڑھ کر نظر دوڑاتیں کہ شاید کہیں پانی یا کوئی شخص نظر آ جائے، جس سے وہ مدد لے سکیں۔ وہ اسی طرح صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان دوڑ رہی تھیں کہ چھے پھیرے مکمل ہو گئے۔

ساتویں مرتبہ اللہ سے دعائیں کرتی ہوئی دوڑیں تو انھوں نے ایک آواز سنی۔ انھوں نے فوراً اسے مخاطب کر کے نیکی کے نام پر مدد کی درخواست کی۔ حضرت جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور انھوں نے اپنی ایڑی زمین پر ماری تو زمین سے پانی کا چشمہ اُبلنے لگا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ہاجرہ ساتویں مرتبہ اللہ سے دعا کرتی ہوئی دوڑیں اور واپس آئیں تو دیکھا کہ بچّے نے بے تابی سے

جہاں ایڑیاں ماریں اور رگڑی تھیں، وہاں سے پانی کا چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ حضرت ہاجرہ نے گھبراہٹ میں پتھر جمع کر کے اس کے اردگرد ایک دائرہ سا بنالیا تاکہ پانی ضائع نہ ہو اور کچھ دنوں کے لیے ذخیرہ ہو جائے اور پانی پر ہاتھ رکھ کے فرمایا: ''زَم زَم'' یعنی (اے پانی) ٹھہر جا ٹھہر جا۔ اسی سے چشمے کا نام بھی ''زَم زَم'' ہو گیا اور اس کا پانی آبِ زم زم کہلایا اور مقدّس پانی گردانا گیا۔

حضرت ہاجرہ نے اسی چشمے کے پاس اپنی رہائش اختیار کر لی۔ چند روز ہی گزرے تھے کہ صحرانشین بدوؤں کا ایک قافلہ قریب سے گزرا۔ انھوں نے اڑتے اور چہچہاتے ہوئے پرندے دیکھے تو قیاس کیا کہ اس مقام پر کہیں پانی ہے۔ پانی کی تلاش وجستجو انھیں حضرت ہاجرہ کے پاس لے آئی۔ حضرت ہاجرہ کے پاس پہنچ کر انھوں نے پانی کی اجازت طلب کی۔ آپ کی اجازت سے ان لوگوں نے خود بھی پانی پیا اور اپنے اونٹوں کو بھی پلایا۔ پانی کی فراوانی دیکھ کر وہ بدو حضرت ہاجرہ کی اجازت سے اپنے خیمے نصب کر کے وہیں مقیم ہو گئے۔

اس کے بعد یہ ماجرا ہوا کہ لوگ آتے گئے اور آباد ہوتے گئے اور یوں ایک شہر آباد ہو گیا۔ پہلے پہل خیموں کا شہر تھا، پھر لوگوں نے پتھروں اور مٹی سے مکانات کی تعمیر شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم شہر وجود میں آ گیا۔ یہ وہی شہر تھا جسے آج مکّہ مکرمہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حضرت ہاجرہ نے پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان اضطراری حالت میں سات چکر لگائے تھے۔ آپ کی وہ ادا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آئی کہ اسے باری تعالیٰ نے حج وعمرہ کا لازمی رکن بنا دیا۔ آج تک اہلِ ایمان بی بی ہاجرہ کی طرح صفا ومروہ کی پہاڑیوں کے درمیان بے تابی سے دوڑتے ہیں جسے ''سعی'' کہا جاتا ہے۔ نبیِ کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم جب تک مکّہ میں رہے۔ آبِ زم زم بڑے احترام کے ساتھ پیتے رہے اور جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو صلح حدیبیہ کے موقع پر منگوا کر پیا اور واپسی میں ساتھ لے کر آئے۔ ان کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسرے صحابہ کرامؓ بھی سفرِ حج کے بعد واپسی میں آبِ زَم زَم ہمراہ لایا کرتے تھے اور یہ رواج اسی ذوق وشوق سے آج بھی جاری ہے۔

حج کے دنوں میں اور ان کے بعد حجّاج اور زائرین کو پانی پلانا ہر دور میں عزّت کا باعث سمجھا جاتا رہا ہے۔ قیامِ مکّہ کے دوران میں حجّاج اپنے پینے کے لیے آبِ زَم زَم کا استعمال رغبت اور کثرت سے کرتے ہیں اور جب وہ اپنے اپنے وطنوں کو لوٹتے ہیں تو تبرّک کے طور پر آبِ زَم زَم کو ساتھ لے جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبیِ کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم فرمایا:

> ''زَم زَم کا پانی جس غرض سے بھی پیا جائے، اسی کے لیے مفید ہوگا۔ اگر شفا کی غرض سے پیا جائے تو اللہ اس سے شفا دے گا اور اگر سیراب ہونے کے لیے پیو گے تو اللہ تمھیں سیراب کرے گا اور اگر تم اللہ سے کسی سلسلہ میں پناہ لینے کے لیے پیو گے تو اللہ تمھیں پناہ دے گا۔ یہ حضرت جبریل علیہ السلام کا کنواں ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سیرابی ہے۔''

تحقیق اور سائنسی تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ زَم زَم کا پانی صاف ستھرا اور ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک اور پینے کے انتہائی قابل اور عالمی معیار کے عین مطابق ہے۔ اس پانی میں یہ وصف ہے کہ یہ بھوکے کے لیے کھانا اور بیمار کے لیے شفا ہے۔ سر درد میں مفید ہے، بینائی کو تیز کرتا ہے اور یہ نیکوکاروں کا مشروب ہے۔ زَم زَم روئے زمین پر پانچ ہزار سال سے جاری ہے اور کبھی کمی واقع نہیں ہوئی اور بیرِ زَم زَم اللہ تعالیٰ کا ارض پاک عرب پر ایسا معجزہ ہے جس میں اہلِ بصیرت کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۲ علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

دنیائے اسلام میں علّامہ اقبالؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک شعلہ بیان شاعر، عظیم المرتبت فلسفی، مناظرِ فطرت کے پرستار، ملّت کے غم خوار اور ایک ماہرِ تعلیم تھے۔ آپ کے اشعار اور آپ کے خطبات نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے مُردہ دلوں میں حیاتِ نو کی شمع روشن کی اور ان کے منجمد جذبات کو آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکا دیا۔ کسی قوم میں آپ جیسا بے نیاز دل کا حامل باکمال شخص سیکڑوں ہزاروں سال کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہی کا شعر ہے جو انھی کی ذات پر صادق آتا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کائنات کے رنگ و بو میں ایسی شخصیات آتی رہتی ہیں جو آسمانِ علم و ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں اور شہرت پا کر رخصت ہو گئیں لیکن علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جیسی مثال آپ کو بہت کم ملے گی۔

علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ کے تاریخی شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ نور محمد ایک صوفی منش انسان تھے۔ آپ ایک ایسے شہر میں پیدا ہوئے جس میں ہر طرف اسلامی تشخص عام تھا۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی۔ آپ کو ابتدا میں ایک ایسا استاد ملا جو اسلامی دین داری کا قابلِ تقلید نمونہ تھا اور شمس العلما سیّد میر حسن جیسے عربی و فارسی کے ممتاز فاضل اور جیّد عالم کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ سیالکوٹ سے ایف اے کرنے کے بعد آپ لاہور چلے آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم اے کے امتحانات اعزاز کے ساتھ پاس کیے۔ یہاں آپ کو پروفیسر آرنلڈ جیسے لائق استاد سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ آپ کو بچپن ہی سے شاعری سے محبت تھی۔ لاہور میں آپ شعر و شاعری بھی کرتے رہے اور آپ نے مختلف مشاعروں میں شرکت بھی شروع کر دی، لیکن ابھی شاعری کا دائرہ محدود تھا۔ کثرتِ مطالعہ سے آپ کے دل میں علمی تحقیق کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ اسی جذبے کے تحت ۱۹۰۵ء میں یورپ روانہ ہوئے۔ انگلستان سے بیرسٹری اور جرمنی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر محمد علّامہ اقبالؒ وطن واپس آئے۔

آپ نے لاہور میں وکالت کا پیشہ اپنایا مگر آپ کا اصل میدان شاعری تھا۔ انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس میں علّامہ اقبالؒ کے نام سے رونق آجاتی تھی۔ آپ کا ایک ایک شعر اشرفیوں میں تُلتا تھا۔ آپ مسلمانوں کے زوال پر بے حد غم ناک تھے اور مسلمان نوجوانوں کو اسلام کی آن پر کٹ مرنا سکھاتے تھے۔ چناں چہ آپ نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کر کے نوجوانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ صدارتی خطبے میں پہلی مرتبہ اسلامیانِ ہند کے لیے آزاد مملکت کا نظریہ پیش کیا۔ گویا یہ پاکستان کا پہلا باضابطہ مطالبہ تھا، اس لیے آپ کو "مصوّرِ پاکستان" کہا جاتا ہے۔ علّامہ اقبالؒ نے نہ صرف تصورِ پاکستان پیش کیا بلکہ اس سلسلے میں قائدِ اعظمؒ کو نہایت مفید مشورے بھی دیے۔

قیامِ یورپ کے دوران میں اقبالؒ نے مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا۔ انھیں فرنگی تہذیب کے کھوکھلے پن کا پتا چل گیا، وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ جدید تہذیب جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے، جس نے آنکھیں چندھیا رکھی ہیں۔ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک علّامہ اقبالؒ کی آنکھوں کو

خیرہ نہ کرسکیں۔حالاں کہ علّامہ اقبالؒ نے زندگی کے طویل ایام یورپ میں گزارے تھے۔اس کی وجہ رسول پاک خَاتَمُ النَّبِیِّنَ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ سے علّامہ اقبالؒ کی والہانہ محبت، جذبۂ عشق اور روحانی وابستگی تھی۔خودی، خودشناسی، تعینِ نفس، شعورِ ذات کا دوسرا نام ہے۔خودی علّامہ اقبالؒ کے نزدیک رازِ حیات ہے۔علّامہ اقبالؒ نے عرفانِ ذات پر زور دیا ہے۔جب تک یہ حاصل نہ ہو، اس وقت تک زندگی میں نہ سوزِ ہستی ہے نہ جذبۂ عشق۔علّامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے سے خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا۔علّامہ اقبالؒ انھیں دوبارہ اسی مقام پر دیکھنے کے آرزومند ہیں۔علّامہ اقبالؒ کو ملّتِ اسلامیہ کی بقا متحد ہونے میں ہی نظر آتی ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

علّامہ اقبالؒ فرد اور جماعت کے رابطے کا ذکر کرتے ہیں۔ان کے خیال میں فرد کی نشوونما جماعت کے موثر آئین کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان دوسروں کے ساتھ رہ کر ہی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکتا ہے، جیسا کہ ان کا کہنا ہے:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

علّامہ اقبالؒ کی شاعری میں مومن کا لفظ بھی خاص توجّہ کا مستحق ہے۔علّامہ اقبالؒ چاہتے تھے کہ مسلمان صحیح معنوں میں مردِ مومن بن جائے۔وہ مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس کا ہر کام خدا کے لیے ہو۔وہ بلند ہوجائے اس کی ذات برائیوں اور ناانصافی کے خلاف ایک چیلنج ہو۔علّامہ اقبالؒ کا تصورِ مردِ مومن قرآن کی خالص پیداوار ہے۔جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں ، اللہ کی بُرہان!
قہاری و غفّاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اسی طرح وہ اپنے کلام میں مردِ مومن کے اوصاف کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مناظرِ فطرت اور قدرت کی تصویر کشی میں علّامہ اقبالؒ کو مہارتِ تامہ حاصل ہے۔آپ کے کلام میں نادر تشبیہات اور تراکیب کی جدّت کا انبار لگا ہوا ہے۔جو ان کی وسعتِ فکر کی دلیل ہے۔قوم نے آپ کو ترجمانِ حقیقت، شاعرِ مشرق، حکیم الامت کے القاب سے نوازا۔حکومتِ برطانیہ نے انھیں ''سر'' کا خطاب دیا۔مگر علّامہ اقبالؒ نے انگریزی حکومت کے بخیے ادھیڑ دیے۔آپ کا کلام اردو فارسی دونوں زبانوں میں ہے۔انھوں نے اس قدر بلند خیالات کا اظہار کیا کہ ایران اور دنیا بھر کے شاعروں اور فلسفیوں نے موجودہ زمانے کو عصرِ اقبال کہہ کر عقیدت کے پھول پیش کیے۔بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کا نصف حِصّہ، ان کے اردو شعری مجموعے ہیں جب کہ فارسی میں پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مثنویِ اسرار و رموز اور ارمغانِ حجاز کا نصف حِصّہ شامل ہے۔

علّامہ اقبالؒ نے اپنے بوڑھے وفادار خادم علی بخش کی گود میں آخری سانس لی اور عالمِ اسلامی میں پھیلے ہوئے دوستوں، شاگردوں اور قدردانوں سے منہ موڑ کر اور ان کو سوگوار چھوڑ کر دین و ادب کا آفتابِ عظمت، جس نے دلوں کو حرارت عطا کی تھی۔ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کا آفتاب نکلنے سے پہلے غروب ہو گیا۔ آپ کے جسدِ خاکی کو بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔ جہاں ہزاروں لوگ ہر روز اِس بطلِ جلیل کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

۳ قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ

ایک مغربی مؤرّخ نے بابائے قوم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''دنیا میں فقط چند افراد ہی ایسے ہوئے ہوں گے جنھوں نے انفرادی طور پر معنی خیز انداز میں تاریخ کے دھارے کو تبدیل کر دیا ہو۔ شاید گنتی کے چند لوگ ہی ہوں گے جنھوں نے دنیا کے نقشے میں ترمیم کر دی ہو اور شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے کسی بکھری ہوئی قوم کو ایک بنا کر اسے ایک ملک دے دیا ہو۔ محمد علی جناحؒ نے یہ تینوں کارنامے انجام دیے۔''

محمد علی جناحؒ، جنھیں تمام پاکستانی اپنا محسن سمجھتے ہیں اور ''قائدِ اعظم'' اور ''بابائے قوم'' کے القاب سے یاد کرتے ہیں، ۲۵ ردسمبر ۱۸۷۶ء کو وزیر مینشن کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پونجا جناح اور والدہ کا نام مِٹھی بائی جناح تھا۔ آپ کے والد، جو گجرات کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے، کراچی میں چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور خوش حال تھے، چناں چہ آپ کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر پر ہوا۔ جب آپ چھے سال کے ہوئے تو آپ کو کراچی کے سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں سے آپ نے چودہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ آپ ایک ہونہار اور ذہین طالب علم تھے اور حصولِ علم کا وافر شوق رکھتے تھے۔ جب آپ نے میٹرک پاس کر لیا تو آپ کے والد آپ کو اپنے ساتھ تجارتی کاروبار میں شریک کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کا کاروبار چمکے مگر آپ کے والد کے ایک مخلص دوست نے محمد علی جناحؒ کی لیاقت دیکھ کر انھیں مشورہ دیا کہ بچے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ بھیجنا چاہیے چناں چہ آپ کے والد نے آپ کو لندن بھیج دیا۔ جہاں سے آپ نے لنکنز اِن یونیورسٹی (Lincolns Inn University) سے بار ایٹ لا کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران میں آپ کا گھرانا کراچی سے ممبئی منتقل ہو چکا تھا۔ چناں چہ آپ بھی ممبئی چلے گئے اور ۲۴ راگست ۱۸۹۶ء کو آپ نے ہائی کورٹ کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرایا اور اس کے ساتھ ہی لا کی پریکٹس شروع کر دی۔ بہت ہی کم عرصے میں آپ نے اپنے رفیقانِ کار سے اپنی لیاقت کا لوہا منوا لیا اور آپ کا شمار ممبئی کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ کچھ عرصہ کے لیے آپ نے بمبئی کے ایڈووکیٹ جنرل کے ساتھ کام کیا پھر عارضی طور پر ریذیڈنسی مجسٹریٹ ہو گئے۔ بعد ازاں آپ کو پندرہ سو روپے ماہوار کے سرکاری عہدے کی پیش کش ہوئی مگر آپ نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ بہت کم عرصے میں اتنی رقم تو میں ایک دن میں کمانے کے قابل ہو جاؤں گا۔

محمد علی جناحؒ کو زمانۂ طالب علمی ہی سے سیاست سے خاصی دلچسپی تھی۔ آپ کے سوانح نگار ہیکٹر بولائتھو ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں زیادہ تر طالب علم زمین پر کانچ کی گولیوں سے کھیلتے تھے جس سے کپڑے گرد آلود ہو جاتے تھے۔ آپ نے طالب علموں سے کہا کہ وہ کانچ کی گولیوں سے نہ کھیلیں بلکہ انھیں کرکٹ کھیلنے کی طرف راغب کیا۔

جب آپ ممبئی میں وکالت کر رہے تھے تو آپ کانگریسی لیڈر دادا بھائی نوروجی سے متاثر تھے اور آپ بھی کانگریس کے بڑے فعال ممبر تھے کیونکہ اس وقت کانگریس ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم تھی مگر جب ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تو آپ نے بھی آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۹۰۹ء میں آپ بمبئی کے مسلم حلقے سے پارلیمانی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۱۳ء تک مسلمانوں کے حقوق کے لیے کام کیا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک آپ ہندو، مسلم اتحاد کے حامی تھے اور ''ہندو، مسلم اتحاد کے سفیر'' کہلاتے تھے مگر جب آپ نے دیکھا کہ کانگریس تو ہندوستان میں ہندوراج کے لیے کام کر رہی ہے تو آپ نے کانگریس سے استعفادے دیا اور مسلم لیگ کو توانا بنانے کے کام میں لگ گئے۔

محمد علی جناحؒ ایک بے باک اور نڈر لیڈر تھے اور فہم وفراست اور جرأت وحق گوئی و بے باکی کی عمدہ مثال سمجھے جاتے تھے بقول علّامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ:

آئینِ جواں مرداں ، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

۱۹۱۶ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو لکھنؤ میں ۳۰ اور ۳۱ ر دسمبر کو منعقد ہوا، آپ کی سیاسی خدمات کی بنا پر آپ کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ ۱۹۱۶ء کا ''میثاقِ لکھنؤ'' جو ہندو مسلم اتحاد کی آخری کوشش تھا، آپ ہی کی کوششوں سے ظہور پذیر ہوا تھا مگر آپ کانگریس کے متعصّبانہ رویّے سے بہت دل برداشتہ ہوئے اور آپ نے نہرو رپورٹ کے جواب میں ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انگریزی حکومت کو کچھ مطالبات پیش کیے جنھیں تاریخ میں ''قائدِ اعظمؒ کے چودہ نکات'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد کے مقام پر ہوا جس کی صدارت علّامہ اقبالؒ نے کی اور انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم انڈیا ودِان انڈیا (Muslim India within India) کی تجویز پیش کی جسے بعد ازاں دوقومی نظریہ یا نظریۂ پاکستان کا نام دیا گیا۔ اس دوران میں قائداعظمؒ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جا چکے تھے اور وہ برِعظیم کے معاملات سے اس قدر دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ انھوں نے لندن ہی میں رہ جانے کا فیصلہ کر لیا مگر علّامہ اقبالؒ نے انھیں پے در پے کئی خط لکھے اور انھیں جتایا کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں اور آپ ہی ان کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے علّامہ اقبالؒ کے مشورے کی بہت قدر کی اور انھوں نے دوقومی نظریے کے تحت مسلمانوں کی آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

۲۳ ر مارچ ۱۹۴۰ء کو جب لاہور کے منٹو پارک، جسے اب اقبال پارک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، میں قائدِ اعظمؒ کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا تو متفقہ طور پر قرار دادِ پاکستان منظور کر لی گئی، جس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ اور آزاد ملکیت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کی مسلسل جاں فشانیوں کے بعد بالآخر حکومت برطانیہ اور کانگریس نے ۳ ر جون ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور اسی روز قائدِ اعظمؒ نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنی تقریر میں مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کے ساتھ ''پاکستان زندہ باد'' کے الفاظ کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ۱۴ ر اگست ۱۹۴۷ء کو مملکتِ خداداد پاکستان وجود میں آ گئی۔ قوم نے اپنے عظیم محسن کی گراں قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں ''قائدِ اعظم'' اور ''بابائے قوم'' اور ان کی بہن فاطمہ جناح کو، جو جدوجہد آزادی میں اپنے بھائی کی شریکِ کار تھیں، ''مادرِ ملّت'' کے القاب دیے۔

قائداعظمؒ کی کوششوں کے نتیجے میں ملنے والی آزادی نے دس کروڑ مسلمانوں کو آزاد قوموں کی صف میں لاکھڑا کیا اور آپ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرّر ہوئے۔

نئی مملکت کے طور پر ابتدا میں بھارت نے پاکستان کی راہ میں بڑے روڑے اٹکائے اور پاکستان کو بڑی مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا، جن میں سے مسئلۂ کشمیر آج تک موجود ہے جس کے تفصیلی بیان کا شاید یہ موقع نہیں مگر یہ ضرور ہے کہ قائداعظمؒ کو ملک کا نظم و نسق چلانے میں دن رات جس قدر محنت کرنا پڑی اُس نے آپ کی صحت کو بُری طرح متاثر کیا۔ ہر چند ڈاکٹروں نے آپ کو مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا مگر آپ نے اپنی صحت کی پروا نہ کی اور ملک کے لیے کام کرتے رہے لیکن تابہ کے، آخر ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ قوم نے اپنے محسن کے شایانِ شان کراچی میں ایک عظیم مقبرہ تعمیر کروایا جو آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ قائدِ اعظمؒ تو ہم سے رخصت ہو گئے لیکن ان کا لافانی کردار آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران
اے قائدِاعظمؒ! تیرا احسان ہے، احسان

۴ حُبِّ وطن

وطن سے محبت کا جذبہ کوئی مصنوعی چیز نہیں بلکہ یہ ایک فطری چیز ہے جو پیدا نہیں کی جاتی بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان دنیا میں جہاں مرضی گھومے پھرے، مگر جو آرام و سکون اُسے اپنے گھر میں نصیب ہوتا ہے، کہیں اور میسّر نہیں آ سکتا۔

وطن گہوارہ ہے۔ وطن ایک جنم بھومی کا نام ہے۔ جس کی زمین، ہوا اور ماحول میں انسان پیدا ہوتا، کھیلتا اور جوان ہوتا ہے۔ وہیں اس کے ماں باپ، بہن بھائی، ہمدرد اور غم گسار موجود ہوتے ہیں۔ انسان کو ان سب چیزوں سے لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ ان سے جدا ہوتے ہی مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے۔ اس لیے وطن کو سوہنی دھرتی کا نام دیا جاتا ہے:

جنّت سے کہیں بڑھ کے حسیں، میرا وطن ہے
ہم سر ہے فلک کی جو زمیں، میرا وطن ہے

وطن ایک گھر ہے، جس سے انسان کی محبت ایک فطری امر ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جانور اور پرندے بھی شام کو اپنے ٹھکانوں اور گھونسلوں میں واپس پہنچ جاتے ہیں۔ انھیں وہیں سکون ملتا ہے، جہاں ان کا گھر ہوتا ہے۔ گویا حُبِ وطن ایک ایسا جوہر ہے جو ہر انسان اور حیوان میں فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ اپنے وطن کی مٹی عزیز ترین متاعِ حیات ہے۔ دیس کے کانٹے سُنبل اور ریحان کے پھولوں سے زیادہ دلکش محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کی رسالت مآب خَاتَمُ النَّبِیّٖن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے جذبۂ حبِ وطن کو ''جزوِ ایمان'' قرار دیا ہے۔

ہمارے نبی اکرم خَاتَمُ النَّبِیّٖن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ کو بھی اپنے وطن مکّہ مکرمہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ جب آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے وہاں سے مدینے کو ہجرت فرمائی تو آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ دُکھی ہو گئے۔ آپ خَاتَمُ النَّبِیّٖن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ نے شہرِ مکّہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے مکّہ! تو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے، لیکن کیا کروں تیرے بیٹے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔''

عربی کا مشہور قول ہے کہ: حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ یعنی وطن کی محبت ایمان کا حِصّہ ہے۔

جس شخص کے دل میں وطن کی محبت کا جذبہ انگڑائی نہیں لیتا وہ جانور ہے۔کوئی شخص دوسرے ملک میں کتنا ہی خوش وخرّم کیوں نہ ہو پھر بھی وطن کی یاد ضرور ستاتی ہے۔اُسے اپنے وطن کی کچی گلیاں لندن اور پیرس کی آراستہ و پیراستہ سڑکوں سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ افغان اور مغل بادشاہ ہندوستان جیسے زرخیز اور عظیم الشّان ملک میں ہونے کے باوجود ایک آدھ دفعہ اپنے وطن ضرور جایا کرتے تھے۔گویا وطن کی فضاؤں میں جو اپنائیت ہے، وہ پردیس میں محسوس نہیں ہوتی ،خواہ انھیں جنّت کا سا دلکش ماحول ہی کیوں نہ میسر آجائے۔

اسی پس منظر میں میر انیس نے کیا خوب کہا ہے:

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل ، جو بچھڑ جائے چمن سے

وطن کی محبت ایک نعرے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے بڑے تقاضے ہیں۔اگر وطن کا ذرّہ ذرّہ عزیز ہے تو قدم قدم پر خون بہانا پڑتا ہے۔اگر اہلِ وطن کے دل و دماغ میں وطن کی محبت رچی بسی ہو تو وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیّار ہو جاتے ہیں۔

اپنے وطن میں تحفّظ کا احساس اور اس کی قدر و قیمت صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھیں ابھی تک دوسروں کی محکومی کرنا پڑ رہی ہے جیسے بوسنیا، کشمیر اور فلسطین کے مظلوم لوگ اپنی ذات کے لیے نہیں لڑ رہے بلکہ نظریاتی احساس کے حوالے سے ایک آزاد وطن کے لیے مصروفِ جہاد ہیں۔خصوصاً اہلِ وطن جب دیارِ غیر میں چلے جاتے ہیں تو وہاں انھیں اپنے وطن کی یاد ستاتی اور تڑپاتی ہے اور اس طرح وہ دن رات اپنے وطن کو یاد کرتے ہیں۔بعض اوقات یہ تڑپ اور لگن اس قدر سر اُٹھاتی ہے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور انسان یہ سوچتا ہے کہ کاش ایسا ہو جائے کہ وہ پلک جھپکتے ہی میں اپنے وطن پہنچ جائے۔

حبِ وطن رکھنے والے اپنے وطن کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔وہ لوگ جنھیں اپنے وطن سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ ہوتا ہے، وہ اپنے وطن میں رُوکھی سُوکھی کھا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔

ایک دَور تھا جب مسلمان برعظیم پر قابض تھے۔پھر آہستہ آہستہ مسلم حکومت زوال پذیر ہوئی تو انگریز قابض ہو گئے۔ہمارے آباواجداد نے حصولِ وطن کے لیے کتنی قربانیاں دیں۔اپنا گھر بار، کاروبار، مال و اسباب، یہاں تک کہ آل و اولاد تک قربان کر دیے۔ لوگوں سے ان کے عزیز بچھڑ گئے۔وہ پاک دامن خواتین جن کی عِفّت کی فرشتے بھی قسمیں کھاتے تھے، وہ بے آبروئی کے سمندر کی بے رحم موجوں کے رحم و کرم پر تھیں۔غرض یہ کہ اپنا وطن پاکستان حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔قیامِ پاکستان کے وقت ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔اب ۷۵ سال گزر جانے کے بعد ہمارا وطن بفضلِ تعالیٰ ترقی کی راہ پر گام زن ہے۔یہ سب کس کے طفیل ہوا؟ یہ سب کچھ انھی پرخلوص لوگوں نے کیا جن کو اپنے وطن سے سچی محبت تھی۔

سر سیّد احمد خاںؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ، فاطمہ جناحؒ، یہ سب وطن کی محبت سے سرشار نظر آتے ہیں۔انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے، اس کی زمین اور آسمان اُسے زندگی اور راحت بخشتا ہے۔اسے آخر وطن سے محبت کیوں نہ ہو، اس کی گلیوں میں اس کا بچپن گزرا۔اس کے درختوں نے اُسے جھُولا جھلایا۔سورج اسے نیند سے جگاتا تھا۔تارے اُس سے باتیں کرتے تھے۔چاند اُسے دیکھا اور اپنے پاس بلایا کرتا تھا۔وطن کے ندی نالوں کے جھرنے اسے گیت سناتے تھے۔اسی لیے جب استاد ابراہیم ذوق کو دکن کے حکمران نے گراں قدر

مشاہرے پر حیدر آباد (دکن) میں آنے کی دعوت دی تو انھوں نے دِلّی کی گلیوں کو دکن کے محلات پر ترجیح دی۔ چناں چہ اُن کا شعر ہے:

اگر چہ دکن میں بہت ہے آج کل قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

پاکستان ہمارا وطن ہے جو اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا۔ اس مُلک کے لیے ماؤں نے اپنے بیٹوں کو، بہنوں نے بھائیوں کو، بیویوں نے اپنے سہاگ اور ننھے بچّوں نے اپنے والدین کو وطن کے نام پر قربان کیا۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے خون کے دیپ جلا کر اس وطن کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ وہ وطن ہے جس کے نظّاروں میں جنّت کی بہاروں کا حُسن اور جس کی زمیں فلک کی ہم سری کا دعویٰ کرتی ہے۔

آج گویا پاکستان ایک حقیقت کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے مگر دُشمن نے اسے دل سے تسلیم نہیں کیا اور وہ ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کسی طرح اس وطنِ عزیز کو تاخت و تاراج کرے، لیکن وطن کے رکھوالے غافل نہیں۔ وہ بازوؤں میں اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ جو اس ارضِ مقدّس کی طرف نظرِ بد سے دیکھے، اس کی آنکھیں نکال دیں اور ان پاؤں کو توڑ دیں جو اس پاک سرزمین کو تاراج کرنے کے لیے آگے بڑھیں:

اے وطن تونے پکارا تو لہو کھول اٹھا — تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں
تیری بنیادوں میں ہے لاکھوں شہیدوں کا لہو — ہم تجھے گنجِ دوعالم سے گراں پاتے ہیں

۵ یومِ آزادی

۱۴؍ اگست ''یومِ آزادی'' کہلاتا ہے۔ اس روز اہلِ پاکستان اپنی آزادی کی سال گرہ مناتے ہیں۔ یہ دن ہر سال آزادی، حریّت اور استقلال کا پیغامبر بن کر آتا ہے۔ جس سے جدوجہدِ آزادی کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے۔ زندہ قومیں اپنی آزادی کے دن کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیّت دیتی ہیں اور اسے شایانِ شان طریقے سے مناتی ہیں۔ پاکستان بھر میں ۱۴؍ اگست کا دن ہمارے لیے ایک قومی تقریب کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر سال انتہائی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔

آج کے دن آزاد ہوئے ہم
آج کے دن سب دُور ہوئے غم

برِعظیم پاک و ہند پر تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت کمزور ہوتی گئی اور انگریزوں کا، جو اس ملک میں تجارت کی غرض سے آئے تھے، اقتدار بڑھتا گیا اور وہ رفتہ رفتہ ملک کے بہت سے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مغلیہ سلطنت کا چراغ، جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا، ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی انگریز پوری طرح ملک پر مسلّط ہو گئے۔

انگریزوں نے حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ مسلمانوں سے بدگمان رہتے تھے کہ اگر انھیں موقع مل گیا تو یہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لینے کی کوشش کریں گے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے اس بدگمانی کو اور مستحکم کر دیا، لہٰذا

انھوں نے مسلمانوں کی قوّت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔اس کے برعکس وہ ہندوؤں کی پشت پناہی کرتے رہے یہاں تک کہ مسلمان روز بروز پستی میں گرتے چلے گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔

مایوسی اور بد دلی کے اس نازک دور میں بعض درد دِل رکھنے والے مسلمان رہنماؤں نے قوم کو تباہی سے بچانے کا بیڑا اُٹھایا۔سر سیّد کا نام ان رہنماؤں میں سرفہرست ہے۔انھوں نے قوم کو بیدار کرنے اور ترقی کی راہ پر چلانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔قوم نے جھرجھری لی۔آنکھیں کھولیں۔اپنی زبوں حالی کی طرف نگاہ ڈالی اور اللہ کا نام لے کر اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔آزادی کی تحریک کی ابتدا آل انڈیا کانگریس نے کی جس کے بانی ایک انگریز تھے۔جن کا نام اے او ہیوم (A.O.Hume) تھا۔

کانگریس کی تمام جدوجہد کا مقصد بظاہر ہندوستان کی آزادی تھا۔ان کا دعویٰ تھا کہ مسلمان، ہندو اور سکھ وغیرہ چونکہ سبھی اسی دھرتی کے سپوت ہیں، اس لیے انھیں ہندوستان کی آزادی کی خاطر مل کر جدوجہد کرنی چاہیے اور جب آزادی حاصل ہو جائے گی تو یہاں ایک ایسی جمہوری اور قومی حکومت قائم کی جائے گی جس کو چلانے میں باشندگانِ ملک کا آبادی کے لحاظ سے برابر کا حِصّہ ہوگا۔

کانگریس کی چلائی ہوئی تحریک ہندوؤں کی عیّاری اور مسلمانوں کی سادگی اور صاحبِ نظر رہنماؤں سے محرومی کی بدولت روز افزوں ترقی کرتی گئی اور متحدہ قومیّت کا تصور کچھ اس طرح مسلمانوں میں رچنے لگا کہ وہ اسلامی تہذیب و روایات سے منحرف ہونے لگے۔اس قسم کے افسوس ناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ مسلمان ہندو تہذیب کے رنگ میں رنگے جانے کو علّامہ اقبالؒ کے اس شعر کے مصداق اپنے لیے باعثِ فخر سمجھنے لگے:

تھا جو ناخُوب بتدریج وہی خُوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

برِعظیم کے مسلمانوں پر جلد ہی یہ بات عیاں ہوگئی کہ کانگریس تو صرف ہندوراج کے لیے کوشاں ہے چناں چہ کانگریس کے یک طرف رویّے سے مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ انھیں بھی اپنی ایک الگ پارٹی بنانی چاہیے جو مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفّظ کر سکے لہٰذا ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کی بنیاد رکھی۔اس جماعت کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا تھا۔

مسلمان رہنماؤں کو جب یقین ہو گیا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی ترقی کسی طرح گوارا نہیں اور وہ اکثریت کے گھمنڈ میں مسلمانوں کو رعایتیں دینا تو درکنار ان کے جائز حقوق تک دینے کے لیے تیّار نہیں تو انھوں نے اپنے ذہن میں الگ وطن کا نقشہ بنانا شروع کر دیا۔اس آزاد اسلامی وطن کا واضح تصوّر سب سے پہلے حضرت علّامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں پیش کیا۔اس وقت مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ الہ آباد میں منعقد ہوا۔علّامہ اقبالؒ اس کے صدر تھے۔انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا:

''میری نگاہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی کش مکش کا واحد حل یہ ہے کہ ہندوستان کے جن صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے انھیں ملا کر انگریزی حکومت کے زیرِ اثر یا اس سے آزاد ایک سلطنت قائم کر دی جائے جس میں مسلمان اپنے مذہب، اپنی روایات اور اپنے تمدن کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کریں۔''

اس وقت مسلمانوں کو جس قسم کا انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی، اس کا صحیح احساس پیدا کرنے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا شرف نمایاں طور پر دو شخصیتوں کو حاصل ہوا۔ایک علّامہ محمد اقبالؒ اور دوسرے قائداعظم محمد علی جناحؒ۔اگر ایک ہستی نے اپنے نغمۂ جاں سوز سے

مسلمانانِ ہند کے اندر ایک نئی روح پیدا کر دی تو دوسری ہستی نے اپنے فکر وعمل سے مسلمانوں کے عزائم کو تحریک بخشی اور بالآخر اہلِ زمانہ نے وہ دن بھی دیکھا جب کانگریس کے متحدہ قومیت کے نعرے کا طلسم پاش پاش ہو کر رہا اور مسلمانانِ ہند نے اپنی شاندار تہذیب کو زندہ رکھنے اور اُسے پنپتا ہوا دیکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور ۲۳ / مارچ ۱۹۴۰ء کو اقبال پارک لاہور میں ایک قرار داد پیش کی جس میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

یہ ساری کاوشیں تھیں، دین کی، ایمان کی خاطر
ہزاروں کلفتیں تھیں، ایک پاکستان کی خاطر

اسلامی تہذیب وتمدن کی برتری پر یقینِ کامل ہی کا نتیجہ تھا کہ ارضِ ہندوستان راس کماری سے لے کر پشاور تک پاکستان کا مطلب کیا؟ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کے نعروں سے گونج اٹھی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح ؒ کی چلائی ہوئی تحریک پاکستان اپنے اسلامی تصوّرات ونظریات کے سبب مسلمانانِ ہند کے دلوں میں اتر گئی۔

تحریکِ پاکستان راستے کی صبر آزما مشکلات کے باوجود قائدِ اعظم ؒ کی اعلیٰ قیادت اور اسلامیانِ ہند کی جرأت واستقامت کی بدولت عروسِ کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا ظہور ہوا اور لاکھوں مسلمان اپنے عزیز واقارب اور گھر بار کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔

پاکستان کو وجود میں آئے ۷۵ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ آج تک یومِ پاکستان ہر سال نہایت شان وشوکت اور جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ ملک بھر میں عید کا سماں نظر آتا ہے۔ بچّے، بوڑھے اور عورتیں اس جشن میں بھرپور حصّہ لیتے ہیں۔ رات کو چراغاں کیا جاتا ہے۔ یومِ پاکستان اس قدر جوش وخروش سے اور جذبے کے ساتھ منایا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حصولِ آزادی کی جدوجہد پھر سے ذہنوں میں تازہ ہو جاتی ہے:

آزادی کا ہر لحظہ پیامِ اَبدیت
محکومی کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

٦ اطاعتِ والدین

(ماں باپ کے ساتھ سلوک)

اللہ تعالیٰ کے بعد والدین ہی اولاد کے سب سے بڑے مُربی ومحسن ہیں۔ جس طرح کسی بھی مذہب میں اللہ تعالیٰ کے احکام سے رُو گردانی جائز نہیں، اسی طرح والدین کی نافرمانی بھی روا نہیں۔ اسی بنا پر اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے بعد سب سے زیادہ احترام بھی والدین کا کیا جاتا ہے۔

دنیاوی رشتے داروں میں والدین کی قدر ومنزلت سب سے اہم ہے اور ماں باپ کا سایہ اولاد کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ اولاد کو دنیا کی ہر نعمت مُیسّر آ سکتی ہے مگر ان کے سر سے والدین کا سایہ اٹھنے کے بعد والدین کی محبت اور شفقت کسی قیمت پر نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ

ہے کہ سمجھ دار لوگ اپنے والدین کی درازیِ عمر کی دعا مانگتے ، اُن کی عزّت وتکریم کرتے اور ان کا ہر حکم فرمانِ الٰہی سمجھ کر سر آنکھوں پر لیتے ہیں۔

ماں باپ دونوں ہی واجب الاحترام ہیں مگر ان میں بڑا درجہ ماں کا ہے، اس کی وجہ ادنیٰ سے تامُّل کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے۔ ماں بچّوں کو اپنی کوکھ سے جنم دیتی ہے، ان کو دو ڈھائی سال تک دودھ پلاتی ہے، اپنی گود میں لیے رہتی ہے، انھیں لوریاں سناتی ہے اور اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ بچّہ کسی وجہ سے رونے لگے تو بے چین ہوجاتی اور امکان بھر بچّے کے رونے کا مداوا کرتی ہے۔

روایت ہے کہ کسی صحابی نے رسولِ کریم ﷺ سے دریافت کیا: ''میری خدمت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟'' تو رحمتِ دو عالم ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: ''تمھاری ماں۔'' پوچھا: ''اس کے بعد؟'' ارشاد ہوا: ''تمھاری ماں۔'' صحابی نے پوچھا: ''اس کے بعد؟'' پھر ارشاد ہوا: ''تمھاری ماں۔'' اور چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا: ''تمھارا باپ۔'' اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد پر ماں کی خدمت کا حق اتنا فائق ہے کہ کوئی بھی شخص کما حقہٗ اس کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ بچّے کی پرورش کے ضمن میں ذرا ماں کی ذمہ داریوں پر غور کیجیے: ماں اپنے بچّے کی خاطر جو تکلیفیں اٹھاتی ہے، اُن کا تصوّر بھی محال ہے۔ خدانخواستہ بچّہ بیمار پڑ جائے تو ماں کی جان پر بن آتی ہے اور جب تک وہ اپنے بچّے کو صحت یاب نہ دیکھ لے؛ سکھ کا سانس نہیں لیتی اور کھانا پینا بھول جاتی ہے۔ بچّہ ماں کی نظروں کے سامنے ہنستا کھیلتا رہتا ہے تو اس کے دل کی کلی کِھلی رہتی ہے۔ بچّے کی خوشی ماں کی خوشی اور بچّے کا غم، ماں کا غم ہے۔ اگر بچّہ کسی شے کے حصول کے لیے ضد کرنے لگتا ہے تو ماں ہزار جتن کرتی ہے اور بچّے کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتی ہے، چاہے خود اسے بھوکا رہنا پڑے۔ جس خلوص اور محبت کے ساتھ ماں بچّے کی تعلیم و تربیت کرنے کا فریضہ نبھاتی ہے یہ صرف اسی کا حصّہ ہے۔ اس لیے ہمارے پیارے نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''جنّت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔'' لیکن یہ جنّت اولاد میں سے اُسی کے حصّے میں آئے گی جو دل و جان سے ماں کی فرماں برداری کرے گا لیکن ماں باپ کا سایہ اولاد کے سروں پر ہمیشہ قائم نہیں رہتا، اس لیے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے سروں پر ماں کا سایہ ہے اور بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ماں کے سائے کے ہوتے اُن کی دعاؤں سے محروم ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی ماں کا سایہ اُس وقت اٹھ گیا تھا جب وہ حصولِ علم کی غرض سے جرمنی میں مقیم تھے، چناں چہ انھوں نے کس حسرت سے کہا:

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاکِ مَرقد پر تِری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دُعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا !

ماں کے ساتھ ساتھ باپ بھی اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے خواب بُنتا ہے اور اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے ہر وہ کام کرتا ہے جو اس کے امکان میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

''والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں تو اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرو اور نہ ان کو جھڑک کر جواب دو بلکہ احترام کے ساتھ بات کرو اور ان کے سامنے نرمی اور رحم کے ساتھ جھک کر رہو اور ان کے حق میں دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار! ان پر رحم فرما! جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا پوسا تھا۔''

اطاعتِ والدین کے موضوع کا لبِ لباب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے بعد سب سے مقدّم حق والدین کا ہے۔
رسول کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

''جو آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کی عمر دراز ہو اور اس کی روزی میں کشادگی ہو، اس کو چاہیے کہ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے۔''

چناں چہ اولاد پر لازم آتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے مقدّم حق والدین کا ہے، اس لیے اولاد اپنے والدین کی مطیع وفرماں بردار اور خدمت گزار رہے اور ان کے ادب، اطاعت اور ان کے حقوق کی نگہداشت میں ذرّہ بھر بھی غفلت نہ کرے کہ اولاد کے لیے دین ودنیا کی بھلائی اسی میں ہے۔

۷ شجر کاری کی اہمیّت وافادیت

شجر کے معنی درخت اور کار کے معنی کام کرنا کے ہیں، چناں چہ شجر کاری کے معنی ہوئے درخت لگانے کا وہ کام جس کو انسان اپنے ہاتھوں انجام دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ روزِ اوّل ہی سے انسان اور درخت کا چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہے کہ انسان درخت کو اپنا ایسا دوست شمار کرتا ہے جس کے بغیر وہ جینے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ قدرت کے نظام ہی کے تحت درخت انسانوں بلکہ تمام جانداروں کے لیے فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب اور آکسیجن فراہم کرتے ہیں، جس سے ہم سانس لیتے ہیں۔ اگر درخت اور پودے نہ ہوں تو ہم سانس بھی نہ لے سکیں۔ علاوہ ازیں یہ درخت اور پودے ہی تو ہیں جو ہمیں خوراک، رہائش، ادویات، فرنیچر اور بہت سی دوسری چیزیں فراہم کرتے ہیں۔ اگر روئے زمین پر درختوں کی ہریالی اور سرسبزی وشادابی نہ ہو تو ہماری زندگی اجیرن ہو جائے۔ یہ درخت ہی تو ہیں جو انسان کے غارت گر ہاتھوں سے پیدا ہونے والی فضائی، زمینی، آبی اور شور کی آلودگی کو کنٹرول کرتے اور انسان کو جینے کا قرینہ سکھاتے ہیں۔ درخت پرندوں اور جانوروں کا گھر، ان کا مسکن اور ان کی خوراک کا ذریعہ ہیں۔

روئے زمین پر پھیلے ہوئے جابجا درخت اور جنگل بنی نوع انسان کے لیے قدرت کا اَن مول تحفہ ہیں۔ درخت نہ صرف سایہ فراہم کرتے ہیں بلکہ یہ ماحولیات کی آلودگی کو کم کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں اور سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچاؤ اور زمین کے کٹاؤ کو روکنے کا بھی اہم ذریعہ ہیں۔

درخت اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جو موسمیاتی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ درختوں کی بدولت بارش کا موجب بننے والے بادل وجود میں آتے ہیں اور انھی کی بدولت بادل برستے ہیں۔ ہمارا وطنِ عزیز پاکستان اس لحاظ سے بڑا خوش قسمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے چاروں موسموں: گرمی، سردی، بہار اور خزاں سے نوازا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ ہمارے ملک میں صرف چار فی صد حصّے پر جنگلات موجود ہیں جو انتہائی کم ہیں اور بڑی تشویش ناک بات ہے جب کہ ہمارے ملک کے مقابلے میں ایران میں ۷ فی صد، بھارت میں ۲۳ فی صد چین میں ۲۲ فی صد اور اور روس میں ۴۴ فی صد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے۔

آج دنیا کے کچھ ممالک کو گلوبل وارمنگ کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ جس میں پاکستان بھی شامل ہے۔ گلوبل وارمنگ میں اضافے کا ایک بڑا سبب درختوں کا بے تحاشا کٹاؤ بھی ہے۔ درختوں کے بے تحاشا کٹاؤ سے فضا میں آکسیجن کم اور کاربن ڈائی آکسائیڈ زیادہ ہو رہی ہے۔

درخت چونکہ کاربن ڈائی آکسائیڈ بطور خوراک استعمال کرتے ہیں لہذا اگر درختوں کا کٹاؤ اسی رفتار سے جاری رہا تو کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اضافہ انسانی صحت کے لیے خطرناک حد تک پہنچ جائے گا اور گلوبل وارمنگ کے اثرات زیادہ ہو جائیں گے کیونکہ ہمارے ملک میں گلوبل وارمنگ سے بچاؤ کے لیے کوئی قابلِ ذکر ٹیکنالوجی موجود نہیں اس لیے حکومت کو لازم ہے کہ وہ شجر کاری مہم کا آغاز کرے اور عوام الناس کو شجر کاری مہم کے متعلق ایک آگاہی مہم جاری کرے۔ پھر جو درخت لگیں ان کے بڑھنے تک ان کی حفاظت کرے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہمارے ملک میں گلوبل وارمنگ کے اثرات کم ہو سکیں گے۔

آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ شجر کاری کے لیے بھی دنیا میں جدید طریقے آ چکے ہیں۔ جن میں ڈرون کے ذریعے سے شجر کاری کی جاتی ہے۔ یہ ڈرون فضا سے زمین پر بیج پھینکتے ہیں جن کے ذریعے سے کم وقت میں ایک وسیع وعریض رقبے پر شجر کاری کا عمل انجام دیا جا سکتا ہے۔ کئی ملکوں مثلاً جاپان اور سری لنکا نے اس ٹیکنالوجی سے، جو ہاتھ سے شجر کاری کے مقابلے میں دس گنا زیادہ تیز اور سُودمند ہے اور رقم بھی بے حد کم خرچ ہوتی ہے، بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

ہر محبِ وطن پر، چاہے وہ طالب علم ہی کیوں نہ ہو، لازم آتا ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، اپنی دسترس میں رہ کر شجر کاری ضرور کرے۔ شجر کاری ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور قرآن مجید میں مختلف حوالوں سے اشجار (درختوں) کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل میں درخت کو اپنی رحمت قرار دیتے ہوئے اس کا ذکر اسی طرح کیا ہے:

''وہی ہے جس نے آسمان سے تمھارے لیے پانی برسایا، جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمھارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اُگاتا ہے۔ زیتون، کھجور، انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

اسی طرح آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے بھی درخت لگانے اور ان کی پرورش و نگہداشت پر بہت زور دیا ہے۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان ہے:

- ''جو شخص درخت لگائے، اس کے بعد اس کی نگہداشت، حفاظت اور نگرانی کر کے (اسے) مکمل پھل دار درخت کی صورت میں بڑا کر دے تو اس کے لیے بڑا ثواب ہے اور یہ صدقۂ جاریہ بن جاتا ہے۔''
- ''جو مسلمان درخت لگائے یا کھیتی باڑی کرے اور اسے انسان جانور اور پرندے کھالیں تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔''

شجر کاری کے حوالے سے ایک دوسری جگہ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

- ''قیامت قائم ہو رہی ہو اور کسی کو شجر کاری کا موقع ملے تو وہ (اس) موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔''

ان تمام باتوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ یہ صرف حکومت ہی کا نہیں بلکہ ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ ہم درختوں سے، جو اللہ کی مخلوق کے لیے انتہائی فیض رساں ہیں، والہانہ پیار کریں۔ درختوں کو تلف کرنا گناہ سمجھیں اور جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں اور ان کی اس طرح حفاظت کریں جس طرح والدین اپنی اولاد کی کرتے ہیں لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم میں سے کچھ ناسمجھ لوگ پودوں کو روندنے اور درختوں کے ساتھ ظلم کرنا روا رکھتے ہیں۔ اے کاش! ایسا نہ ہو۔

۸ ٹیکنیکل ایجوکیشن

مولانا حالی نے کسی زمانے میں کس قدر درست کہا تھا:

کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے جس کو سمجھے افشائی نہ اشراقی

مفہوم یہ ہے کہ علمِ کفش دوزی (جوتے بنانے کا علم) افلاطون (یونانی فلسفی) کے علم سے بہتر ہے اور یہ چیز وہ نکتہ ہے جو افشائی اور اشراقی (ایرانی فلسفیوں) کی سمجھ میں نہیں آئے۔ دراصل شاعر نے اس شعر میں علم اور ہنر کا موازنہ کیا ہے اور ہنر کو بے عمل علم پر فوقیت دی ہے۔ اسی شاعر نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کا سبب بیان کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ کہا ہے:

ہر اِک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ
ہراک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل ویکتا ہوئے وہ
سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں اُن کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

یعنی کہ مسلمانانِ عالم جب تک عملی فنون کے متلاشی رہے، ان کا شمار اقوامِ عالم میں سب سے بلند مرتبے پر ہوتا رہا مگر جب انھوں نے اس طرف سے پہلو تہی کی، وہ اپنے مرتبے سے نیچے گرتے چلے گئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام عالمِ اسلام بالعموم اور پاکستان کے نوجوان بالخصوص اسی طرف بھرپور توجّہ دیں تا کہ ان کو وہ اقوامِ عالم میں پھر سے اپنا کھویا ہوا مقام ومرتبہ حاصل کر سکیں۔

ہر چند تعلیم اور ہنر بظاہر دو متضاد چیزیں ہیں لیکن دونوں کا تعلق عقلِ انسانی سے ہے۔ تعلیم یعنی حصولِ علم ایک نعمتِ الٰہی اور ایک ایسی دولت ہے جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہِ راست پر لے آتی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ خَاتَمُ النَّبِیّٖن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ علم و ہدایت کا پیکر بن کر آئے اور دنیا کے اندھیرے کو علم کے نور سے روشن کر دیا۔ باری تعالیٰ نے قرآن مجید فرقانِ حمید میں جابجا ارشاد فرمایا ہے کہ:

''اہلِ علم اور جاہل کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔'' (الزُمر: آیت ۹)

یعنی اسلامی تعلیمات میں دینی اور دنیاوی دونوں علوم کے حصول پر زور دیا گیا ہے۔ دنیاوی علوم سے مراد وہ تعلیم ہے جو ہم اپنے تعلیمی اداروں میں حاصل کرتے ہیں۔ اس زُمرے میں سائنس، ریاضی، انجینئرنگ، ڈاکٹری، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ تمام علوم شامل ہیں، جن کے حصول میں بلا دریغ زندگی کا ایک بڑا حصّہ اور لاکھوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر طالب علموں کا مقصد ڈگری کا حصول ہوتا ہے۔ جس کے بعد وہ نوکریوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ اگر ایک عام آدمی بے مقصد ڈگری لینے کے لیے دوڑ دھوپ کے بجائے کسی ہنر کو سیکھنے کی طرف توجّہ دے تو اس کی زندگانی زیادہ کارآمد ہو۔

ہمارے ملک کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اربابِ اختیار پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں کی توجّہ ہنر مندی، جسے ہم ٹیکنیکل

ایجوکیشن یا فنی تعلیم کہتے ہیں، کی طرف مبذول کرے اور اس ضمن میں سہولتیں پیدا کرے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن ممالک نے فنّی تعلیم از قسم : چمڑا سازی، دھات سازی، زراعت، چوب کاری، ظروف سازی اور کپڑا سازی وغیرہ کی تعلیم کو اپنی عمومی تعلیم کا حصّہ بنا کر اس پر بھرپور توجّہ دی، وہاں معاشی ترقی کی شرح زیادہ کہیں زیادہ ہے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کسی بھی معاشرے کے معاشی استحکام کی ضامن ہوتی ہے لیکن افسوس ہے کہ فی زمانہ پاکستان میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی شرح صرف ۶ فی صد ہے جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح ۶۶ فی صد سے بھی زیادہ ہے۔

نوجوانوں کی فنّی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے حکومتی کاوشوں کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سیکٹر کی شراکت بے حد اہمیّت کی حامل ہے کیونکہ ہمارے ملک میں سرِ دست سرکاری، پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ صرف تیس ہیں جب کہ پرائیویٹ سیکٹر میں یہ تعداد تین فی صد سے متجاوز ہے۔ اس اعتبار سے اربابِ اختیار و اقتدار کے فنّی تعلیم کے شعبے میں دلچسپی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ہمارے ہونہار اور باصلاحیت طالب علموں کو معلوم ہونا چاہیے کہ موسم گرما کی تعطیلات خصوصاً میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کے بعد اگلی جماعت میں داخلہ لینے تک کا طویل عرصہ کوئی ٹیکنیکل ورک یا کام سیکھنے کا بہترین وقت ہوتا ہے۔ آپ کے گھر کے نزدیک اگر کوئی ایسا ادارہ ہے جہاں آپ کو بلا معاوضہ یا معمولی معاوضہ کے عوض ہنر سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے تو آپ ہفتہ کے مقررہ دنوں میں یا ہر روز مقررہ اوقات میں کام سیکھنے کے لیے وقت نکال سکتے ہیں۔ یہ چیز یقینی طور پر آپ کی عزّت و آبرو میں اضافے کا موجب بنے گی کیوں کہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

''کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی''

یعنی اگر آپ دنیا میں معزز ہونا چاہتے ہیں تو (کسی نہ کسی کام میں) کمال حاصل کریں۔

۹ انفارمیشن ٹیکنالوجی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

علّامہ اقبال کا یہ شعر، جو انھوں نے تقریباً سو سال پہلے کہا تھا، محیّر العقول ایجادات کے پیشِ نظر آج کے زمانے پر کس قدر صادق آتا ہے۔

فی زمانہ ریڈیو، ٹیلی فون، کیلکولیٹر اور کمپیوٹر جیسی قبیل کی اہم ایجادات نے انسانی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے اور انٹرنیٹ کی ایجاد اس زندگی میں مزید انقلابات لے کر آئی ہے۔ جدید مواصلات اور پلک جھپکتے ترقی کی منازل طے کرنے کے اس جدید نظام کو اصطلاح میں انفارمیشن ٹیکنالوجی یا آئی ٹی کہا جاتا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اصطلاح کا اطلاق، جس نے ٹیکنالوجی سیکھنے اور معلومات کی جدید ترقی میں بے پناہ امکانات پیدا کیے ہیں، دنیا بھر میں ٹیکنالوجی کی تمام ترقّیوں پر ہوتا ہے۔ ٹیلی وژن حالیہ زمانے کی ایک جدید ایجاد اور ہر گھر کا ایک اہم حِصّہ ہے۔ آج کے دَور میں ٹیلی وژن محض تفریح ہی کا وسیلہ نہیں بلکہ یہ ان کی زندگی میں بہت سی مفید معلومات کا ذریعہ بھی بن چکا ہے اور ہم گھر بیٹھے بٹھائے طرح طرح کے پروگرام اور خبریں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح کمپیوٹر جدید دور کا الٰہ دین کا چراغ یا عمرو عیّار کی وہ زنبیل ہے

جس میں ہمارے لیے لامحدود اور نت نئی معلومات کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے۔اس مشین کا بنیادی مقصد معلومات کو یک جا کر کے ہمارے لیے مرتّب و منظّم کرنا ہوتا ہے۔تعلیم و تربیت کا شعبہ ہو یا صحّت و تندرستی کا،صنعت و حرفت کا میدان ہو یا سیاسیات و معاشیات کا،انفارمیشن ٹیکنالوجی نے ہر جگہ اس مضبوطی سے پنجے گاڑے ہوئے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں کی ناگزیر ضرورت بن کر رہ گئی ہے جب کہ انٹرنیٹ نے دنیا کو ایک گھرانے کی مانند اس طرح باہم مربوط و منظّم کر دیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ اور بات چیت بھی کر سکتے ہیں اور دفتری کام کاج کو بھی وسیع پیمانے پر پھیلا سکتے ہیں۔یہ انٹرنیٹ ہی تو ہے جس کے ذریعے سے گھر بیٹھے دنیا بھر کی معلومات تک رسائی مؤثر انداز میں اور بآسانی ممکن ہے۔گھر بیٹھے دنیا جہان کی کتابوں اور رسائل و جرائد کا مطالعہ ہوسکتا ہے اور گھر بیٹھے تجارتی سامان کی خرید و فروخت ہوسکتی ہے۔گویا انٹرنیٹ کے توسّط سے دنیا نے ایک عالمی گاؤں (Global Village) کی شکل اختیار کر لی ہے۔موجودہ دَور میں تیز ترین اور فوری رابطے کا ایک ذریعہ ای میل ہے جو انٹرنیٹ کی وجہ ہی سے ممکن ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بلا شبہ ہماری زندگی کو آسان تر بنا دیا ہے اور ہم مڑ کر پیچھے بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔اکیسویں صدی کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی کہا جاتا ہے اور دنیا بھر میں پل پل میں رونما ہونے والے واقعات کو بریکنگ نیوز کے نام پر جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے سے برق رفتاری سے لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے۔چند سال پہلے کا نامہ نگار کاغذ پر نیوز لکھ کر بذریعہ ڈاک روانہ کرتا تھا جس مین کافی وقت صرف ہوتا تھا جب کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی سہولت سے یہ کام اب ای میل کے ذریعے سے فوری ہونے لگا ہے۔دنیا بھر کے اخبارات کا مطالعہ،اپنی پسند کی کسی کتاب یا مواد کو اپنے ڈیسک ٹاپ سکرین یا لیپ ٹاپ یا موبائل پر تلاش کرنا اور پڑھنا اب خواب نہیں رہا بلکہ ہماری روزمرّہ زندگی کی حقیقت بن گیا ہے۔

عصرِ حاضر میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے بڑھتے ہوئے استعمال نے ہماری قومی زبان اردو کو بھی اس نئی ترقّی سے ہم آہنگ ہونے کا حوصلہ دیا ہے۔جو زبان پہلے قلمی کتابت کے ذریعے سے اخبارات و رسائل اور کتابوں کی صورت میں عوام تک پہنچتی تھی،اب کمپیوٹر کتابت اور الیکٹرانک ذرائع سے ہم آہنگ ہو کر ترقّی کی راہیں طے کر رہی ہے۔اردو یونیورسٹیوں کا قیام بعض خلیجی و سارک ممالک اور افریقا و امریکا میں منعقد عالمی سمینار اور مشاعرے و مجالس،سیکڑوں ویڈیو،آڈیو پروگرام،ڈاکومینٹری،انٹرنیٹ پر دستیاب اردو کی بے شمار ویب سائٹس،امریکا،آسٹریلیا اور یورپ سے شائع ہوئے روزنامے اور رسائل و جرائد نے اس زبان کو نئی وسعت عطا کی ہے اور ایک اندازے کے مطابق دنیا میں کم و بیش اردو بولنے،سمجھنے اور لکھنے والے ایک ارب عوام اور فاصلاتی نظامِ تعلیم کے دائرے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ:

''اردو کے روئے زیبا کی کشش سے پروانے خود بخود اس کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔''

مرزا غالب و علّامہ اقبالؒ اور فیض احمد فیض نے اردو زبان کی جو وراثت چھوڑی تھی،اس پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میٹریل سے نئی نسل نے ایک شاندار عمارت تعمیر کی ہے اور اردو بھی دنیا کی دیگر اہم زبانوں کی طرح 21 ویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔پہلے اردو زبان اور اس کی تعلیم محض ریڈیو اور ٹیلی وِژن تک محدود تھی۔ان دنوں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے سہارے اس کا دائرہ کار ورلڈ وائیڈ ویب World Wide Web کے ذریعے سے بڑھ گیا ہے اور ای لرننگ،ای ایجوکیشن،مائیکرو چپس اور ای میل کے ذریعے سے انسان نے دنیا کو ایک مٹھی میں بند کر دیا ہے اور اس زبان نے سائبر اسپیس میں بھی اپنے قدم جمائے ہیں۔جس کی زندہ مثال ہماری اردو زبان ہے۔دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح پہلے اس خط نے رومن رسم الخط کا سہارا لیا لیکن جلد ہی اس نے نئے جہاں کے آداب سیکھ لیے اور اردو نے بھی دنیا کی

دیگر زبانوں کی طرح پورے وقار کے ساتھ سائبر سپیس (Cyber Space) میں اپنی جگہ بنالی۔

آج آپ اردو میں گوگل پیج پر یُونی کوڈ میں کسی بھی شاعر یا ادیب کا نام ٹائپ کر کے اس سے متعلق معلومات اور مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ یونی کوڈ سے پہلے یہ سب سہولیات اردو زبان میں میسّر نہیں تھیں۔ یونی کوڈ نظام کی وجہ سے جہاں انگریزی لکھی جاتی تھی، وہیں پر اب اسی طرح اردو بھی لکھی جانے لگی ہے۔ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی ہمہ جہت افادیت کے پیشِ نظر یہ خوشی کی بات ہے کہ ہماری اردو زبان بھی اس قابل اور اس لائق ہو چکی ہے کہ وہ جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہو سکے اور اردو نے بھی خود کو کمپیوٹر کی زبان بنالیا ہے۔ اب ہمیں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے استعمال کے لیے کسی اور زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم پورے کمپیوٹر کو اردو میں منتقل کر سکتے ہیں اور یہ ناممکن کام اردو یُونی کوڈ نے ممکن کیا ہے۔

انٹرنیٹ پر اردو میں ڈیجیٹل لائبریری اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی سائٹس موجود ہیں۔ آج سے صرف بیس سال پہلے ان پیج کے ذریعے سے کمپیوٹر پر اردو کتابت کا کام شروع ہوا اور اردو اخبارات اور کتابیں کمپیوٹر پر خوب صورتی سے آراستہ ہو کر شائع ہونے لگی تھیں، مگر جب دنیا میں کمپیوٹر کا استعمال بڑھا اور ٹیلی وژن، سیل فون اور دیگر ٹیکنالوجی کے آلات میں اردو کے استعمال کی ضرورت بڑھی تو اردو کے علاوہ دنیا کی تمام زبانوں کو کمپیوٹر کے ایم ایس آفس پروگرام اور انٹرنیٹ پروگراموں میں شامل کرنے کے لیے زبانوں کا یونی کوڈ نظام شروع کیا گیا اور اس اعتبار سے کی بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، اردو میں جمیل نوری نستعلیق اور علوی نستعلیق فانٹس تیار ہوئے جن کی مدد سے کسی بھی اپلیکیشن، فیس بک، ٹویٹر اور دیگر اپلیکیشنوں اور سیل فون میں اردو لکھنا آسان ہو گیا اور ان پیج کو یونی کوڈ میں منتقل کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کا بیش قیمت ذخیرہ انٹرنیٹ پر محفوظ کر دیا گیا۔ آج اگر کوئی گھر بیٹھے اپنے کمپیوٹر پر کلّیاتِ اقبالؒ، دیوانِ غالب، مضامین سر سیّد یا کوئی اور کتاب دیکھنا چاہتا ہے وہ یونی کوڈ کی سہولت کو گوگل سرچ میں استعمال کرے تو اسے اردو زبان و ادب کا ایک نیا جہاں نظر آئے گا۔ علّامہ اقبالؒ نے کسی زمانے میں درست کہا تھا کہ:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

١٠ ڈینگی بخار

ہر چند اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسانوں کو اَن گنت نعمتوں سے نوازا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کو ہر زمانے میں طرح طرح کی آزمائشوں اور مصائب سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں متعدد قدرتی آفات اور مختلف قسم کی بیماریاں اور امراض شامل ہیں۔ کبھی ملک کے کسی حصّے میں زلزلہ آجاتا اور بربادی پھیلاتا ہے، کبھی سیلاب اس قدر تباہی پھیلاتے ہیں کہ صورتِ حال کو سنبھالنے میں برسوں لگ جاتے ہیں اور بعض اوقات کسی ملک میں وبا پھوٹ پڑتی ہے تو سیکڑوں ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ یہ آفات اور وبائیں کسی مسلم یا غیر مسلم یا پس ماندہ یا ترقی یافتہ قوموں میں امتیاز نہیں کرتیں البتہ ترقی یافتہ ممالک اپنے سابقہ تجربات، وسائل اور منصوبہ بندی سے صورتِ حال پر جلد قابو پا لیتے ہیں جب کہ پس ماندہ ممالک کے حکمرانوں کی نااہلی یا بدعنوانی کی وجہ سے صورتِ حال سنبھل نہیں پاتی اور وہ محض

دوسرے ممالک سے امداد کی امید لگا لیتے ہیں۔

ڈینگی بخار بھی ایک وبا ہے اور چونکہ یہ وبا نسبتاً ایک نئی وبا ہے اس لیے اس نے جو خوف و ہراس پھیلایا اس پر پاکستانی سخت پریشان ہوئے۔ اس وبا سے پہلے ۱۹۹۴ء میں کراچی میں اور پھر ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۱ء میں لاہور میں اور بیرون لاہور (زیادہ تر پنجاب) بلکہ پورے ملک میں سیکڑوں مریضوں کی جان کا نذرانہ لیا۔ حکومت پنجاب نے اس کے خلاف ایک زبردست مہم چلائی اور بڑی حد تک ڈینگی کا سدّ باب تو کر دیا مگر پوری طرح قلع قمع نہیں ہو سکا اور ۲۰۲۲ء میں اس وبا سے لوگ پھر پریشان ہیں۔

حفظِ ماتقدم کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ڈینگی کیا ہے؟ اس کی علامات اور علاج کیا ہے اور وہ کون سی احتیاطی تدابیر ہیں جن کے اختیار کرنے سے اس وبا سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

اسباب: ڈینگی بخار ایک مچھر (Aedes) کی مادہ کے کاٹنے سے پھیلتا ہے۔ گھر کے اندر پائے جانے اس مچھر کے جسم پر سیاہ اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہی مادہ مچھر انسانی جسم میں وائرس داخل کرتی ہے اور جب ڈینگی کے مریض کو کاٹنے کے بعد وہ صحت مند آدمی کو کاٹے تو وہی وائرس اس میں بھی داخل ہو جاتا اور اسے بھی بخار ہونے لگتا ہے۔ یہ مچھر دس ملی میٹر تک لمبا اور انسانی خون کا بڑا رسیا ہوتا ہے۔ اس جنس کے مچھر عموماً سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے اور سورج غروب ہونے کے ذرا بعد زیادہ فعال ہوتے ہیں۔ ذرا سے تصرّف کے بعد یہاں کسی استاد کا یہ شعر حسبِ حال ہے:

''دو ہی لمحے راس ہیں مجھ کو یہاں دن رات میں''
اک ترے آنے سے پہلے، اک ترے جانے کے بعد

علامات: ڈینگی بخار کی بہت سی علامات ہیں۔ ان میں سے جب بھی کوئی علامت ظاہر ہو تو معالج سے رجوع کرنا چاہیے۔

- مچھر کے کاٹنے کے سات دن کے اندر اندر بخار آنے لگتا ہے جو عموماً ایک سو دو درجے سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔
- سر میں شدید درد ہوتا ہے۔ خصوصاً آنکھوں کے پچھلے حصّے اور جسم کے جوڑوں میں شدید درد ہوتا ہے۔
- بھوک کم ہو جاتی اور پیاس بڑھ جاتی ہے۔
- جی متلاتا ہے اور اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔ قے آتی ہے، مریض تھکن اور گھبراہٹ محسوس کرتا ہے۔
- آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور جسم پر سرخ دانے (دھپڑ) ظاہر ہو جاتے ہیں اور خارش بھی ہوتی ہے۔
- غنودگی طاری ہوتی ہے اور مریض بے چینی محسوس کرتا اور مسلسل کراہتا ہے۔
- مریض کے پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے۔
- ڈینگی کی شدید ترین قسم (DHF (Dengue Hemorrhagic Fever ہے، جس میں مریض کے مسوڑوں اور دیگر اعضا سے خون رسنے لگتا ہے۔ خوراک کی نالی سے خون رسنے کی صورت میں کالے رنگ کے پاخانے آتے ہیں۔
- انجمادی خلیوں یعنی Platelets (پلیٹ لٹس) کی کمی اور سرخ خلیوں کی زیادتی اس بخار کی بڑی علامت ہے۔

علاج: ہمارے یہاں سماجی ادویات میں سے ایک روایت یہ ہے کہ مریض کی عیادت کے لیے آنے والے نوے فی صد افراد مریض کو

علاج کے بارے میں کچھ ہدایات اور اپنے تجربات کا اطلاق مریض پر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ غلط روایت ہے۔ لازم ہے کہ مریض اور اس کے لواحقین مرض کی تشخیص اور علاج کے لیے ہمیشہ مستند ڈاکٹر یا طبیب کی ہدایات پر عمل کریں۔ تادمِ تحریر ڈینگی کی ویکسین ابھی تک تیار نہیں ہو سکی البتہ ڈبلیو ایچ او نے ڈینگی کے علاج کے لیے جو تجاویز دی ہیں، ان کی اہمیّت بہت بڑھ گئی ہے۔

- بلڈ ٹیسٹ کرائیں۔
- مریض کا ہر گھنٹے کے بعد چیک اپ کیا جانا چاہیے اور اگر انجمادی خلیے (Platelets) کم ہو جائیں تو ڈرپ لگائی جائے اور خون بھی دیا جانا ضروری ہے۔
- ڈینگی کے مریض کو عام طور پر پیناڈول یا پیراسٹامول تجویز کرتے ہیں۔ یہ دوا ہر تین یا چار گھنٹے کے بعد دیں۔
- مریض کو نارمل خوراک کے ساتھ جُوس، سُوپ اور پانی زیادہ مقدار میں دیں۔
- اسپرین، بروفین اور سٹیرائیڈ سے پرہیز کریں۔

احتیاطی تدابیر: بعض اوقات مرض سے زیادہ مرض کا خوف انسان کے لیے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا مریضوں کی شرح اموات پانچ چھے فی صد ہے۔ جسے ایک یا نصف فی صد تک لایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام اور حکومت درج ذیل احتیاطی تدابیر ضرور اختیار کریں۔

- ذاتی سطح پر خود کو خود کو مچھر کے کاٹنے سے بچائیں۔ پوری آستین کی قمیض پہنیں۔ سوتے وقت مچھر دانی کا استعمال کریں۔
- مچھروں کی افزائش اور پناہ گاہوں کو ختم کریں۔ مثلاً گھروں کو کاٹھ کباڑ، شاپنگ بیگز، ٹوٹے پھوٹے برتن، کھلونے، پلاسٹک اور شیشے کی چیزوں سے صاف رکھیں۔ انھیں بیچ دیں یا پھینک دیں۔
- گھریلو سطح پر یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ گملوں، کیاریوں، بالٹیوں، بوتلوں، کچرے کے ڈرموں، روم کولروں وغیرہ میں کہیں بھی پانی کھڑا نہ رہنے دیں۔
- استعمال ہونے والے پانی کے ذخیرے کے برتنوں اور کوڑے دان کو ڈھانپ کر رکھیں۔
- گھروں میں سپرے کروائیں اور جالیوں سے کمروں کو اس طرح بند رکھیں کہ مچھروں کو کمروں میں آنے کا راستہ نہ ملے۔
- ہمارے یہاں ہر سال، ان گنت افراد ملیریا اور ہیپاٹائٹس سے مر جاتے ہیں۔ مگر ڈینگی کی دہشت ان سب امراض سے زیادہ ہے۔ ۲۰۱۱ء کے بعد ۲۰۲۲ء میں ڈینگی کا خوف پھر سامنے آیا ہے کیونکہ اس سال کچھ زیادہ ہی مریض سامنے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس موذی مرض سے محفوظ رکھے!

۱۱ فوگ اور سموگ: اسباب، اثرات اور تدارک

اکیسویں صدی کے انسان کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ ان مسائل میں ایک سفّاک اور سنگین مسئلہ فوگ اور سموگ سرِ فہرست ہے۔ جب دھواں اور درجہ حرارت کم ہونے کی وجہ سے دھند (فوگ) آپس میں اتصال کرتے ہیں تو اتصال سے سموگ جنم لیتی ہے۔ یہ

ایک قسم کی فضائی آلودگی ہے جِسے فوٹو کیمیکل سموگ بھی کہا جاتا ہے اور یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نائٹروجن آکسائیڈز جیسے دیگر زہریلے ذرّات سورج کی حدّت سے مل کر اپنا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیمیائی اجزا سانس کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہو کر صحت کے لیے ہمہ گیر اور ہمہ جہت مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خرابی، سانس کی تکلیف اور آنکھوں میں شدید جلن وہ ظاہری علامات ہیں جو سموگ کے باعث ہر عمر کے شخص کو بری طرح متاثر کرتی ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ سموگ انسانی صحت کو ایسے نقصانات بھی پہنچاتی ہے جو بظاہر فوری طور پر دکھائی نہیں دیتے لیکن وہ کسی بھی شخص کو موذی اور مہلک مرض میں مبتلا کر سکتے ہیں جیسا کہ پھیپھڑوں کی خرابی یا کینسر کا موذی مرض وغیرہ۔ طبی ماہرین کی تحقیق ہے کہ بچّے اور بوڑھے سموگ سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ موسمِ سرما میں پاکستان کا صوبہ پنجاب بالخصوص لاہور شہر، سموگ کے مہلک اثرات کی زد میں آ جاتا ہے۔ موسمِ سرما میں لاہور کا ایئر کوالٹی انڈیکس پاکستان کے دیگر شہروں کی نسبت سب سے زیادہ ہو جاتا ہے اور انسانی صحت پر مضر اثرات مرتّب کرنا شروع کر دیتا ہے جو لاہور میں رہنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

قدرتی طور پر کرّۂ ارض کے اردگرد گیسوں کا ایک غلاف موجود ہے، جس میں نائٹروجن، آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر گیسیں بہ لحاظِ وزن ایک خاص تناسب سے فضا کا حصّہ بنتی ہیں اور بقائے حیات کے لیے ضروری ہیں۔ مگر بے تحاشا انسانی آبادی اور چاروں طرف صنعتوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے فضا میں ان گیسوں کا تناسب بگڑ گیا ہے اور فضا میں مختلف قسم کی مضرِ صحت گیسیں جمع ہو گئی ہیں، جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ صنعتی چمنیوں سے نکلنے والی گیسیں، ٹریفک کی لاتعداد گاڑیوں اور خشت سازی کے بھٹوں سے نکلنے والا دھواں، کچّے راستوں اور شکستہ سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی آمد و رفت سے اٹھنے والے گرد و غبار کے بادل فضا کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ یہ آلودگی متاثرین کی صحت پر نہایت مضر اثرات مرتّب کرتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ فضائی آلودگی سے نباتات بھی بری طرح متاثر ہوتی ہیں اور قریبی عمارات کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

معدنی ایندھن کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کثرتِ مقدار توازن سے کہیں زیادہ بڑھ کر فضائی آلودگی کا سبب بنتی ہے۔ اس توازن کے بگڑنے سے تمام وافر کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا کے گیسی غلاف میں ایک دبیز تہ کی صورت میں جمع ہو جاتی ہے۔ یہ تہ سورج کی روشنی سے حاصل ہونے والی حرارت کو اس گیسی غلاف سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ اس اثر کے تحت گزشتہ کچھ سالوں سے ہمارے یہاں کے اوسط درجہ حرارت میں اضافہ ہوا ہے۔ ماحولیاتی سائنس دانوں کے مطابق درجہ حرارت میں یہ اضافہ نہایت ضرررساں اور ماحولیاتی آلودگی کا سبب بنتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اشفاق احمد ورک:

پھیلی جاتی ہے ہر طرف آلودگی
کون روکے گا بڑھ کر یہ بے ہودگی

تدارک:

ان تمام خدشات اور خطرات کے حوالے سے بطور ایک ذمہ دار شہری ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ شاہراہات پر رواں دواں، دھواں اُگلتی گاڑیوں کو مکمل طور پر بند کر دیں اور ایسی پبلک ٹرانسپورٹ کو متعارف کرائیں جن سے دھواں نہ نکلتا ہو اور وہ ماحول کو آلودہ بھی نہ کر سکے۔ درختوں کے کٹاؤ بلکہ قتلِ عام پر سختی سے پابندی عائد کر دی جائے اور نئے درختوں کی کاشت میں اضافہ کر دیں کیوں کہ درخت ہی فضائی

آلودگی روکنے اور آکسیجن کی پیداوار میں مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ آلودگی کو کم کرنے کے لیے نچلی سطح تک لوگوں میں آگہی مہم شروع کرنی چاہیے تاکہ لوگ اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھ سکیں اور آلودگی کو کم کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ دُور کے سفر کے لیے ریلوے کو ترجیح دی جائے کیونکہ یہ واحد ذریعہ ہے جس میں آلودگی کے پھیلنے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ ہر سطح کے نصابات میں ماحولیاتی آلودگی کے اسباب اور تدارک پر اسباق شامل کیے جائیں۔ ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں آگہی کو عام کیا جائے۔ اخبارات، رسائل اور جرائد میں معلوماتی فیچر لکھے جائیں جس سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔ ہر علاقے سے روزانہ کی بنیادوں پر کوڑا کرکٹ اُٹھانے کا اہتمام کیا جائے۔ محلے کی سطح پر ایسی کمیٹیاں بنائی جائیں جو اپنے علاقے میں فضائی آلودگی کو پھیلنے سے بچانے کی کوشش کریں۔ وزارتِ ماحولیات کو اس ضمن میں انتہائی متحرک اور فعال کرنے کی ضرورت ہے۔ محض زبانی جمع خرچ سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ صرف بنی نوع انسان ہی فوگ اور سموگ کے مضر اثرات سے متاثر نہیں ہو رہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی دوسری تمام مخلوقات بھی شدت سے متاثر ہو رہی ہیں۔ سمندر میں موجود آبی حیات ہو یا فضا میں موجود پرندے یا کرۂ ارض پر موجود دوسرے تمام جانور، سب اس خاموش قاتل کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔ عالمی سطح پر اس کے تدارک کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ ابھی کم ہیں اور ان میں معتد بہ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔

لاہور میں حالیہ سموگ اور فضائی آلودگی کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال نے شہریوں کی زندگی اور صحت کو کیسے متاثر کیا ہے، اس بارے میں لاہور کے رہائشیوں نے بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی تکلیف بیان کی ہے۔ ڈیڑھ سال کی ایک بیٹی کی پڑھی لکھی والدہ نے بی بی سی کو بتایا کہ ان کی بیٹی سموگ سے بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا گلا خراب، کھانسی، بخار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے مُنھ میں چھالے بھی نکل آئے ہیں۔ اس وجہ سے اسے کھانے پینے میں شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ لاہور شہر میں بسنے والے لاکھوں افراد سموگ سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنی کے ایک سیلز مین کا کہنا ہے، کہ اس کا روزگار ایک ایسے کام سے منسلک ہے جس کی وجہ سے سارا دن گھر سے باہر رہ کر موٹر سائیکل چلانا پڑتی ہے۔ میں مختلف پوائنٹس پر جا کر اپنی پراڈکٹ کی مارکیٹنگ کرتا ہوں اور جب دن بھر کام کر کے گھر جاتا ہوں تو فضائی آلودگی اور سموگ کے باعث میری آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور ان میں شدید جلن شروع ہو جاتی ہے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے آنکھوں میں جلن اور پانی آنے کے باعث جگہ جگہ بائیک روک کر پانی سے آنکھیں دھونا پڑتی ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد پھر تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ فضائی آلودگی سے کثافت زدہ ماحول نہایت مہلک ہوتا ہے جس کے خوفناک نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم معدنی ایندھن کا متبادل تلاش کریں۔ مثلاً شمسی توانائی، پانی اور ہوا کی قوت سے حاصل شدہ توانائی کا استعمال نہ صرف معاشی اعتبار سے سودمند ہوگا بلکہ اس طرح فضائی آلودگی میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہوگی۔ اس کے علاوہ فضائی آلودگی سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ ان صنعتوں میں جو فضائی آلودگی کا زیادہ سبب بنتی ہیں، فاضل گیسوں کے کیمیائی معالجے کے لیے پلانٹ نصب کیے جائیں اور یہ کام ٹھوس بنیادوں اور حکومتی سطح پر ہو۔ اسی طرح موٹر گاڑیوں کے زہریلے دھوئیں کے اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک تو سیسے سے مُبرّا پٹرول کے استعمال کو فوقیت دی جائے، دوسرے گاڑیوں کو درست حالت میں رکھا جائے اور دھواں دینے والی گاڑیوں کو قانون کی گرفت میں لیا جائے۔ درخت قدرت کا انمول عطیہ ہیں، جو فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر کے صحت مند آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی جگہوں پر، جہاں کارخانوں کی بہتات

ہے یا کثرت سے گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں، کثرت سے درخت پیدا کیے جائیں۔ علاوہ ازیں کارخانوں کی وجہ سے فضا کو آلودگی سے بچانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ کارخانے آبادی سے زیادہ سے زیادہ فاصلے پر لگائے جائیں اور کارخانوں کے اردگرد اور آبادی کے درمیان بہتات سے درخت لگائے جائیں۔ ہم بے احتیاطی سے فصلوں پر کیڑے مار ادویات کی صورت میں زہر چھڑک کر اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں، اس بارے میں ضابطوں سے ہرگز تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

انسان کے اردگرد کا ماحول اس کی فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ صحت مند انسانوں ہی سے صحت مند معاشرے جنم لیتے ہیں جب کہ صحت کی قیمت پر کوئی بھی ترقی خوش آیند نہیں ہوا کرتی۔ انسان دوستی اور پائیدار معاشرے کے شفاف تصوّر کے لیے ہر شخص کو جہاں تک اس کی دسترس ہے، اپنا فرض ادا کرنا ہوگا۔ چنانچہ ہم پر لازم آتا ہے کہ ایک تو ہم ماحولیات کے بنیادی اصولوں کی پیروی کریں، دوسرے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ چہار عناصرِ فطرت (ہوا، پانی، مٹی اور آگ) کی پاسداری اور فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کریں۔ ہم پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہم چیزوں کو کفایت سے استعمال کریں اور تیسرے فوگ اور سموگ سے بچنے کے لیے بے تحاشا درخت لگائیں اور اگر ایک درخت کاٹنا پڑے تو اس کی جگہ پانچ درخت لگائیں اور اپنی ضرورتیں اس طرح پوری کریں جن کی وجہ سے وسائل پر بوجھ نہ پڑے ورنہ ان کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان کی نگہبانی کریں۔

۱۲ تعلیمِ نسواں اور ملکی ترقی

''نسواں'' کا لفظ ''نساء'' کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ''عورت'' کے ہیں۔ چناں چہ تعلیمِ نسواں کے معنی ہوئے عورتوں کی تعلیم۔ علم ایک ایسی دولت ہے، جس کا ہر انسان، خواہ وہ مرد ہے یا عورت، محتاج ہے۔ علم روشنی ہے، علم نور ہے۔ کہتے ہیں: ''ہر کمالے را زوالے'' یعنی ہر کمال کو زوال ہے لیکن علم ایسی دولت ہے جس کو زوال نہیں۔ علم ایسا دوست ہے جو سفر ہو یا حضر، خَلوت ہو یا جَلوت ہر جگہ انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ علم انسان کو نیکی اور بدی میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ اسی لیے سرورِ کائنات خَاتَمُ النَّبِيِّنَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ کا فرمان ہے: ''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔''

دورِ جدید کے مہذّب اور متمدّن معاشرے میں تعلیمِ نسواں کی اہمیت سے انکار جاہلیت اور کم عقلی ہے۔ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پہیّا بھی ناکارہ ہو جائے تو زندگی کی گاڑی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ ہر گھر ایک چھوٹی سی سلطنت کی مانند ہے جس میں شوہر بادشاہ اور بیوی وزیر ہوتی ہے۔ بادشاہ خواہ کتنا ہی منتظم اور لائق کیوں نہ ہو اگر اس کا وزیر دانا نہیں تو وہ امورِ سلطنت میں بادشاہ کو صحیح مشورہ نہیں دے سکے گا۔ چناں چہ ایسی سلطنت کا روبہ زوال ہونا فطری امر ہے۔ اس لیے ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کا حاصل کرنا بھی از بس ضروری ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اقوامِ عالم میں صرف وہی قومیں سب سے آگے ہیں جن کی عورتیں حصولِ تعلیم و تربیت میں مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔

کسی دانا کا قول ہے کہ ماں کی گود بچّے کی پہلی درس گاہ ہے۔ بچّہ جو کچھ ماں کی گود میں سیکھتا ہے، وہ اس کی آیندہ تمام زندگی پر اثر انداز رہتا ہے۔ اس لیے بچّے کی بہتر نشوونما اور تہذیب و تربیت کے لیے ماں کا تعلیم یافتہ ہونا بہت اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ

نپولین نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''آپ مجھے اچھی مائیں دیں، میں آپ کو بہترین قوم دوں گا۔'' نپولین کے اس قول کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مہذّب اور تعلیم یافتہ ماں ہی اپنی اولاد کی صحیح معنوں میں تعلیم و تربیت کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایک جاہل عورت اپنی جہالت کے سبب نہ صرف قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے بلکہ اپنے بچّوں کا مستقبل بھی تاریک کر دیتی ہے۔

یہ بات بڑی خوش آیند ہے کہ آج کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں پاکستانی خواتین زیورِ علم سے آراستہ ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کارکردگی دکھا رہی ہیں۔ اس کی ایک بڑی واضح مثال ارفع کریم کی ہے جنھوں نے کم عمری ہی میں مائیکرو سافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل کا اعزاز حاصل کیا اور مائیکرو سافٹ کمپنی کے مالک بِل گیٹس نے بھی اُن کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا لیکن افسوس کہ وہ کم عمری ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ لاہور میں ارفع کریم ٹاور انھی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

اس کی دوسری بڑی مثال ڈاکٹر نگار جوہر کی ہے جنھوں نے میڈیکل سائنس کے شعبے میں گراں قدر خدمات دیں اور انھیں پاکستان کی برّی فوج میں لیفٹیننٹ جنرل کے اعلیٰ عہدے تک پہنچنے کا شرف حاصل ہوا۔

علاوہ ازیں سیاست کے خارزار میں بھی ملکی خواتین آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس کی ایک مثال مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح ؒ کی اور دوسری مثال محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہے جو نہ صرف ''وزیرِ اعظم'' کے جلیل القدر عہدے پر متمکن رہیں بلکہ جنھوں نے پاکستانی خواتین کو علم و فضل و ہنر سے آراستہ کرنے کے لیے بھی بڑی جدوجہد کی۔ آج ملک کے مرکزی و صوبائی اداروں میں پاکستانی خواتین نے اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا ہے۔ کوئی بینک ہو یا سرکاری و غیر سرکاری دفتر کہیں بھی خواتین کی کارکردگی مردوں سے کم نہیں ہے، خصوصاً ہسپتالوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خواتین اپنے فرائض بطریقِ احسن انجام دے رہی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر کہا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کائنات کا سارا حُسن عورت کے وجود کا رہینِ منّت ہے اور زندگی کا سوزِ دروں اسی ساز سے نکلتا ہے مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عورت علم و حکمت اور فہم و فراست سے آراستہ ہو۔ جدید ضروریاتِ زندگی نے عورتوں کو اس امر کا احساس دلایا ہے کہ انھیں گھر کی چار دیواری سے نکل کر دفتروں، بازاروں اور صنعت و حرفت کے مراکز میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے۔

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ تعلیم یافتہ خواتین ہی باعزّت روزگار کے حصول میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ عصرِ حاضر میں عورتوں کے لیے معاشرے میں ایک بہتر مقام متعین ہو چکا ہے۔ مخلوط تعلیم کے اداروں کے ساتھ ساتھ خواتین کے لیے اَن گنت الگ درس گاہیں بھی بن چکی ہیں، جہاں وہ بغیر کسی مزاحمت کے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مواقع کی اس فراوانی سے خواتین بھرپور استفادہ کریں تا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے قوم کی فلاح و بہبود میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے یہاں طبقۂ خواتین کی اکثریت تعلیم کی کمی کی وجہ سے تنگ نظری، تعصّب، جہالت اور توہم پرستی کا شکار ہے۔ اگر ہم انھیں ان معاشرتی امراض سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں خواتین کو تعلیم کے حوالے سے انھیں ہر قسم کی سہولیات فراخ دلی سے فراہم کرنا ہوں گی۔

خواتین کو دُنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہیے تا کہ وہ آیندہ نسلوں کی مثبت خطوط پر تربیت کر سکیں۔ جن ممالک اور معاشروں نے زندگی کے تمام شعبوں میں حیران کن ترقی کی ہے، انھوں نے اپنی خواتین کی تعلیم کو اوّلین ترجیح دی ہے۔ افسوس کا مقام ہے

کہ ہمارے وطنِ عزیز پاکستان میں فی الحال عورتوں کی شرح خواندگی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ہمیں بحیثیت قوم اسے اپنی اوّلین ترجیح بنانا ہوگی۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر ہم قوموں کی برادری میں ممتاز اور مؤقر مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۴ عِیدَین

عیدین کے لغوی معنی ہیں: دونوں عیدیں، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ دنیا بھر کے مسلمان سال میں دو بڑے تہوار مناتے ہیں: ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ، اس لیے دونوں عیدوں کو ''عیدین'' بھی کہا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر خوشی کے موقع کو بھی عید کہتے ہیں اور عید الفطر تو خوشی کا ایک بڑا موقع ہے اور مسلمانوں کے لیے ماہِ رمضان کے روزے رکھنے کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے، اس لیے عید کے حوالے سے بہت سے محاورے زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مثلاً: عید کا چاند ہونا، عید کا چاند نکلنا، عید کرنا، عید منانا، عیدی آنا، عیدی جانا، عید کے پیچھے ٹر ومنانا وغیرہ۔

عید الفطر جسے میٹھی عید یا سویّوں والی عید بھی کہا جاتا ہے، یکم شوال کا چاند دیکھ کر منائی جاتی ہے۔ عید الفطر کے موقع پر عید نماز سے بہر صورت پہلے غریبوں اور محتاجوں کو ایک خاص صدقہ دیا جاتا ہے جسے فطرانہ کہتے ہیں۔ اسی نسبت سے عید کا نام عید الفطر ہے۔ فطرانہ ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ دراصل فطرانہ غریبوں اور مسکینوں کی مدد ہے اور وہ عید سے قبل اس لیے ادا کیا جاتا ہے تاکہ یہ لوگ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہوسکیں۔

بوڑھے ہوں یا جوان، علما ہوں یا فقرا، بچیاں ہوں یا عورتیں، عید کے موقع پر سبھی خوش وخرّم نظر آتے ہیں۔ کوئی مصافحہ تو کوئی معانقہ کر کے خوش نظر آتا ہے۔ بوڑھے اس لیے خوش ہیں کہ ان کو اپنی زندگی میں ایک اور رمضان کے روزے رکھنا نصیب ہوئے اور انھوں نے پورے روزے رکھے اور عبادت و ریاضت سے خوب ثواب کمایا۔ علما اور فقرا اس لیے خوش ہیں کہ انھوں نے تراویح پڑھیں، اعتکاف میں بیٹھے اور ان کے شاگردوں اور مریدوں میں ان کا تقدّس اور بڑھا۔ جوان اس لیے خوش ہیں کہ خدا خدا کر کے روزوں کے دن ختم ہوئے، اب رات دن جو چاہو کھاؤ پیو، چین سے رہو:

ماہِ رمضان گزشت و عید آمد

بچّے اور بچیّاں اس لیے خوش ہیں کہ سکول سے چھٹی ہے، عیدی ملے گی، کھلونے خریدیں گے، جھولے لیں گے، اچھلیں گے، کودیں گے، سویّاں اور طرح طرح کے پکوان کھائیں گے۔

مسلمانوں کی دوسری عید، عید الاضحیٰ ہے۔ عید الاضحیٰ ہر سال ماہِ ذی الحج کی دس تاریخ کو منائی جاتی ہے۔ عید الاضحیٰ کی نماز بھی عید الفطر کی طرح نمازِ فجر کے بعد صبح صبح ادا کی جاتی ہے اور نماز کی ادائیگی کے بعد صاحبِ حیثیت لوگ جانور ذبح کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے واقعے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے لے گئے۔

اللہ تعالیٰ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت و فرماں برداری بے حد پسند آئی چناں چہ جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گلے پر چھری رکھی، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک دُنبا لے آئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ دُنبا ذبح کرنے کا حکم ہوا اور آپ نے اسے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی پیش کی۔ علاّمہ اقبالؒ نے اسی پس منظر میں کیا خوب کہا ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

قربانی کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ کو تمھاری قربانی کا گوشت یا خون نہیں پہنچتا، پہنچتا ہے تو صرف تقویٰ۔'' (سورۃ الحج، آیت ۳۷)

قربانی کے ثواب کے بارے میں نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے: ''قربانی کے جانور کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ہے۔'' لیکن یہ نیکی تب ہی ملتی ہے جب قربانی سچے دل سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کی جائے۔ قربانی کے گوشت میں سے کچھ حِصّہ نکال کر غریبوں اور مفلسوں تک پہنچانا ایک نیک عمل ہے۔ ایسا کرنے سے وہ لوگ بھی، جو قربانی کی اہلیت نہیں رکھتے، ہمارے ساتھ خوشیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔

عیدین کی نماز پڑھنے کا ایک خاص طریقہ ہے، وہ یہ کہ: عید کی نماز میں دو رکعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد خطبہ ہوتا ہے۔ عید کی نماز کی پہلی رکعت میں ثنا کے بعد تین تکبیریں اور دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے تین تکبیریں کہی جاتی ہیں یعنی عید کی نماز میں باقی نمازوں سے چھے تکبیریں زائد ہوتی ہیں۔ عید کی نماز عید گاہ میں اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہے۔ نمازِ عید کے بعد تمام مسلمان ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے اور گلے ملتے ہیں۔

عیدین کے لیے کچھ خاص سنّتیں ہیں۔ بچّوں پر لازم آتا ہے کہ انھیں ہمیشہ یاد رکھیں:

- نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم عید کی نماز ہمیشہ عید گاہ میں ادا فرماتے۔
- عید کے روز غسل فرماتے، مسواک کرتے، اچھّا لباس زیبِ تن فرماتے اور خوشبو لگاتے۔
- نمازِ عید کی ادائیگی کے لیے پیدل جاتے اور عید گاہ جاتے ہوئے ایک راستہ اپناتے اور واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرتے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملاقات کر سکیں۔
- عید الفطر کی نماز سے پہلے فطرانہ ادا کر دیتے اور عید الاضحیٰ کی نماز کے فوراً بعد قربانی کرتے۔
- عید الفطر کی نماز کے لیے جاتے ہوئے آہستہ آہستہ آواز میں اور عید الاضحیٰ کی نماز کے لیے جاتے ہو بلند آواز میں تکبیر پڑھتے:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

- عید الفطر کی نماز سے پہلے گھر سے جاتے وقت کوئی میٹھی چیز تناول فرماتے۔

دینِ اسلام کی یہ دونوں عیدیں مسلمانوں کو خوشی کے اظہار کا موقع دیتی ہیں اور ایک ہی معاشرے میں رہنے والوں کی مدد اور خبر گیری کا ذریعہ بنتی ہیں۔ بالآخر یہ عیدیں ہم سے ایک سال کے لیے بچھڑ جاتی ہیں اور لوگ اگلے سال کی عیدوں کے انتظار میں بڑی حسرت سے لگ جاتے ہیں تاکہ ان کی لذّتِ کام و دہن کا پھر سے خاطر خواہ انتظام ہو۔

۱۴ لائبریری

انگریزی میں لائبریری اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کتابوں، رسالوں، اخباروں اور پڑھنے کے لیے اسی نوعیت کا قدیم وجدید مواد یکجا رکھا جاتا ہے۔ اردو اور فارسی میں اس کے لیے "کتب خانہ" اور عربی میں "دارالکتب" کے الفاظ آتے ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ کے لیے تقریباً ہر اچھے تعلیمی ادارے میں مختلف مضامین کی کتابوں کا ایسا ذخیرہ موجود ہوتا ہے جہاں طلبہ اور اساتذہ لائبریری پیریڈ یا اپنے فارغ اوقات میں جاتے ہیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے کتابوں کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے لائبریری میں ایک آدھ ایسا گوشہ ہوتا ہے، جہاں وہ سکون سے پڑھ سکتے ہیں اور کوئی ان کے مطالعے میں حارج نہیں ہوتا، اسے ریڈنگ رُوم یا دارالمطالعہ کہتے ہیں۔ بعض طلبہ یا اساتذہ کو اپنی مطلوبہ کتاب زیادہ وقت کے لیے درکار ہوتی ہے تو وہ اسے لائبریری کلرک سے اپنے نام پر چند دنوں کے لیے ایشو کروا لیتے ہیں اور مقررہ دنوں کے بعد لائبریری کو بحفاظت تمام واپس کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

کوئی بھی زندہ معاشرہ لائبریری کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ترقی یافتہ معاشروں کے افراد اپنی ذاتی لائبریری کا بھی انتظام کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ اسے وسعت دیتے چلے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں اب موبائل لائبریریوں کا رواج عام ہو رہا ہے اور موبائل لائبریریوں کے ذریعے سے فروغِ مطالعہ عمدگی کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے۔

لائبریری سکول سطح کی ہو، کالج یا یونیورسٹی سطح کی ہو یا جنرل لائبریری ہو۔ لائبریری میں چھوٹے بڑے سبھی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ لائبریری میں ہر موضوع کی صرف مستند اور معتبر کتابوں ہی کا اضافہ کیا جائے۔ اچھی کتاب کا مطالعہ ہی دراصل زندہ مطالعہ ہوتا ہے جو دل کو قوت اور توانائی بہم پہنچاتا ہے مگر غیر معیاری کتاب کا مطالعہ دل کو مردہ کرتا ہے، اس لیے کتابوں کے انتخاب میں چھان پھٹک کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ نئی نسلوں تک تازہ افکار کی ترسیل ہو سکے۔

بارود کے بدلے ہاتھوں میں آ جائے کتاب تو اچھّا ہو
اے کاش! ہماری آنکھوں کا اکیسواں خواب تو سچّا ہو

اقوامِ عالم کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ قوموں کی برادری میں رہبری اور رہنمائی کا فریضہ فقط وہ قوم ادا کر سکتی ہے جس کے افراد میں مطالعۂ کتب کی عادت پختہ ہو چکی ہو۔ کسی شخص کو یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں تعلیمی ادارہ کس سطح کا ہے تو وہ وہاں کی لائبریری دیکھ لے۔ ایک عمدہ لائبریری ہی کسی تعلیمی ادارے کے معیار کی کسوٹی ہوتی ہے۔ لائبریری میں کم و بیش ہر مضمون کی کتابیں موجود ہوتی ہیں، جنھیں لائبریری کے اربابِ اختیار شعبہ وار خاص ترتیب سے رکھتے ہیں۔ منظّم طریقے سے کتابیں رکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مطلوبہ کتاب کی تلاش میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ کتابوں کو ترتیب و تنظیم سے رکھنا ایک باقاعدہ علم ہے جسے "لائبریری سائنس" کہا جاتا ہے۔ طلبہ یا اساتذہ کشاں کشاں لائبریری میں آتے ہیں، اپنے ذوق کے مطابق کتاب مستعار لیتے ہیں اور اپنے علم کی پیاس بجھاتے ہیں۔ بعض طلبہ یا اساتذہ اپنے خاص مضمون کے علاوہ اپنے علم میں اضافے کے مُتمنّی ہوتے ہیں، مثلاً کسی کو شعر و ادب کا ذوق ہے، کوئی افسانے یا ناول پڑھنا پسند کرتا ہے، بعض تاریخی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں، کچھ ایک کو جغرافیائی یا سائنسی معلومات بڑھانے کی دُھن ہوتی ہے، جب کہ بعض دینی ذوق کے حامل اشخاص کو اپنی شخصیت میں نکھار کے لیے مذہب کے بارے میں معلومات درکار ہوتی ہیں۔ لائبریری میں ان سب کی تشفی کا وافر سامان موجود ہوتا ہے

، جہاں وہ ''فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست'' کے مصداق اپنی تشنگی دُور کر سکتے ہیں۔ سابق امریکی صدر ابراہم لنکن کہا کرتے تھے: ''میرا سب سے بہترین دوست وہ ہے جو مجھے وہ کتاب تحفہ دے جو میں نے پہلے نہ پڑھی ہو۔''

دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر طلبہ لائبریری سے دوسروں کی دیکھا دیکھی یا اپنے ساتھیوں پر علمیّت کا رعب بٹھانے کے لیے کتابیں تو اپنے نام ایشو کروا لیتے ہیں مگر کتاب کا پوری توجّہ سے مطالعہ نہیں کرتے اور نہ کتاب سے استفادہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے طلبہ پڑھائی میں دوسرے طلبہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کچھ طلبہ لائبریری کی کتاب کو حفاظت سے نہیں رکھتے، یا تو کتاب کے ورق پھاڑ دیتے ہیں یا پھر کتاب پر جا بجا نشان لگا دیتے ہیں، جس سے کتاب کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں بے ذوقی ظاہر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے طلبہ طالب علم نہیں ہوتے بلکہ انھیں ''علم چور'' کہنا چاہیے جو طلبہ کے لبادے میں تعلیمی اداروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ہونہار طلبہ لائبریری سے بڑے قرینے اور سلیقے سے پورا پورا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر ان کی طلب صادق ہے تو وہ اس ضمن میں اپنے اساتذہ کرام اور سینئر طلبہ سے بھی مشورہ لیتے رہتے ہیں۔ جو طالب علم کتابیں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے، اُن کے لیے لائبریری ایک نعمتِ غیر مُترقبہ ہے۔ اپنے کورس پر عبور حاصل کرنا تو ہر ادارے کے تمام طلبہ کا مقصد ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ اکثر طلبہ بوجوہ اپنے مطالعے میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، چناں چہ وہ لائبریری کا رخ کرتے ہیں۔ لائبریری میں مخطوطات یا کچھ قیمتی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ایشو نہیں کرایا جا سکتا، ایسی کتابوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی بہتر صورت یہ ہے کہ طلبہ یک سوئی کے ساتھ مطالعہ کریں اور زیرِ مطالعہ کتاب میں سے ضروری نِکات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں یا انھیں نوٹ کرتے جائیں تا کہ وہ اپنی ذات اور اپنی تعلیم کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ ہر اچھی لائبریری میں تازہ ترین اخبارات اور متنوّع قسم کے رسائل و جرائد بھی آتے ہیں، باشعور طلبہ ان سے بھی بقدرِ ظرف فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتاب ہماری تنہائی اور تخلیے کا سب سے قابلِ اعتماد ساتھی ہے۔ یہ ہماری بوریت آمیز تنہائی کو معطر تنہائی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اکیسویں صدی میں کوئی ملک اور کوئی معاشرہ لائبریری کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اس بات کا شعور حاصل ہونا چاہیے کہ دنیا میں صرف وہی اقوام سرفراز اور سربلند ہوتی ہیں جنھیں لائبریری کے قیام میں دلچسپی ہوتی ہے۔ کتاب کے حوالے سے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ایک کتاب سرہانے رکھ دی، ایک چراغ ستارا کیا
مالک! اس تنہائی میں، تُو نے کتنا خیال ہمارا کیا

۱۵ گداگری

(اسلام میں گداگری کی مذمّت)

کسی سے کچھ مانگنا یعنی بھیک مانگنا یا دستِ سوال دراز کرنا ''گداگری'' کہلاتا ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں اس قبیح رسم کو بڑی تیزی کے ساتھ فروغ مل رہا ہے۔ اس برائی کو ختم کرنے کے لیے جتنی زیادہ کوشش کرنی چاہیے تھی، اس کے برعکس اس کو پھیلانے کے لیے اتنا ہی تیزی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ گداگری مہذب معاشرے میں ایک لعنت سے کم نہیں ہے اور گداگری مہذّب ملکوں میں رسوائی اور ذلّت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور مہذّب ملکوں میں اس برائی کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے مناسب اقدام اٹھائے جاتے ہیں۔

گداگروں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلی قسم تو ان لوگوں کی ہے جو کسی مجبوری یا حالات کی ستم ظریفی سے تنگ آ کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو تن آسانی کے عادی ہوتے ہیں۔ محنت اور مشقت کرنے کو ان کا دل نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہیں اور اسی کو اپنا باقاعدہ پیشہ بنا لیتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اب تو گداگری ایک باقاعدہ انڈسٹری کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ مختلف لوگوں نے معذور اور اپاہج لوگوں کے گروہ بنا رکھے ہیں۔ یہ لوگ ان معذور لوگوں کو صبح سویرے ایسے مقامات پر بٹھا جاتے ہیں جہاں لوگوں کی بہت زیادہ ریل پیل اور ہجوم ہوتا ہے۔ یہ معذور افراد مختلف قسم کی آوازیں کستے اور راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ معذور افراد بھیک مانگنے اور صدا لگانے کے حوالے سے بھی نفسیاتی طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں۔ راہ جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ اگر کوئی نوجوان کتابیں اٹھا کر جا رہا ہو تو اس کو دعا دیں گے کہ اللہ تجھے اچھے نمبروں سے پاس کرے۔ اگر کوئی فائل اٹھا کر جا رہا ہے تو اس سے کہیں گے کہ اللہ تجھے بہتر نوکری دے۔ ایسے ہی اگر کوئی نو بیاہتا جوڑا چلا جا رہا ہو تو دعائیں دیں گے اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ اس طرح راہ چلتے ہوئے کے دل میں خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی ضرور مدد کرنی چاہیے کہ اس نے مجھے موقع کی مناسبت سے دعا دی ہے۔

نبی پاک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے گداگری کی شدید الفاظ میں مذمّت کی ہے۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کا فرمان ہے: ''اے مسلمانو! اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ احکامِ الٰہی بجا لاؤ اور لوگوں سے کچھ نہ مانگو۔''

آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے ایک مقام پر مزید ارشاد فرمایا: ''جو شخص بھیک مانگتا ہے۔ قیامت کے روز اس کے چہرے پر سیاہ داغ ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔'' اس حدیثِ پاک میں آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے نہایت ہی سخت الفاظ میں بھیک مانگنے کی مذمّت کی ہے۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم کے صحابہ کرام سوال کرنے کے معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ اگر سواری کی حالت میں کسی کے ہاتھ سے چابک گر جاتا تو کبھی ساتھی سے نہیں کہتے تھے کہ مجھے چابک پکڑا دو۔ خود سواری سے نیچے اترتے اور چابک اٹھاتے کہ کہیں یہ بھی سوال کرنے کے زُمرے میں داخل نہ ہو اور آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے کسی سے کچھ مانگنے سے منع فرمایا ہے۔ ایک دفعہ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا:

> ''ہم میں جو شخص اپنی رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور وہاں سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے اور اس کو فروخت کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی حاجت رفع کرے۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگے اور وہ اس کو کچھ دیں یا دھتکار دیں۔''

اگرچہ اسلام میں گداگری کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے اور بھیک مانگنے والوں کو عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، مگر اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ غریب اور فقرا کی مدد کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کی بابت کہا ہے: ''یہ لوگ دوسرے لوگوں سے لپٹ لپٹ کر سوال نہیں کرتے'' اصل میں ایسے ہی لوگ ہماری امداد کے مستحق ہوتے ہیں، جو دوسروں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور نہ ہی اپنی زبان سے لوگوں کے سامنے اپنے حالات بیان کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تلاش کریں اور ان تک ان کا حق پہنچائیں کیونکہ اسلام نے زکوٰۃ فرض ہی اس لیے کی ہے کہ معاشرے سے گداگری کی لعنت کا خاتمہ کیا جائے۔

اسلام یہ نہیں چاہتا کہ کوئی شخص کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور اس کی عزتِ نفس مجروح ہو۔ اسلام تو ہر شخص کی توقیر چاہتا ہے، اسی لیے آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا کہ جب صدقہ کرنے لگو تو دوسرے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہو۔

ایک اخباری سروے کے مطابق پاکستان میں بہت سے بھکاری منشیات کے عادی ہیں۔ ایسے حضرات کے پاس جب نشہ کرنے کے لیے روپیا پیسا ختم ہو جاتا ہے تو یہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا شروع کر دیتے ہیں، ایسے لوگوں کا علاج معالجہ کرا کے انھیں معاشرے کا مہذّب فرد بنایا جا سکتا ہے۔

گداگری کو معاشرے میں سے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حکومتِ وقت اس حوالے سے مناسب اقدامات کرے۔ حکومت کو چاہیے کہ زکوٰۃ کے نظام کو بہتر کرے اور زکوٰۃ کا مصرف درست مقامات پر کیا جائے۔ حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ غریب لوگوں کی امداد کے لیے ایسے اداروں کی تشکیل کریں جو غریب لوگوں کو بلاسود قرضہ دیں تا کہ لوگ آسانی سے اپنی روٹی کما سکیں۔ اگر کوئی نوجوان اور تندرست شخص بھیک مانگتا ہے تو بھیک دینے سے بہتر ہے کہ اس کے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کر دیا جائے تا کہ وہ محنت مزدوری کرے اور اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پال سکے۔

ایک سروے میں یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی ہے کہ پاکستان میں بہت سے بھکاری ایسے ہیں جو کروڑوں روپے کی جاگیروں کے مالک ہیں، مگر اپنی عادت سے مجبور اور تن آسانی کی وجہ سے محنت مشقت کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اگر ہم اپنے روپے پیسے کا صحیح استعمال کریں تو اس گروہ کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل تدابیر کو بروئے کار لا کر گداگری جیسے مکروہ پیشے کا انسداد کیا جا سکتا ہے:

- ہمیں یہ عہد کر لینا چاہیے کہ کسی غیر مستحق کو کسی صورت میں بھی امداد نہیں دی جائے گی۔ خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اس بات پر عمل کرنے کی تلقین کی جائے۔
- علما اور واعظین کا فرض ہے کہ وہ اپنی تقاریر میں اور وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو آزادی اور بے باکی کے ساتھ اس ذلّت آمیز پیشے سے دُور رہنے کی تلقین کریں۔
- سیدھی ساری عورتوں کو جو ہر فقیر کی آواز کو غیب کی آواز سمجھتی ہیں، انھیں صدقات وغیرہ دینے سے باز رکھا جائے۔
- اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے سے کام کرنے کی عظمت اور گداگری کی مذمّت بیان کی جائے۔
- گداگروں کو محنت اور کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

گداگری ہر حوالے سے ہمارے معاشرے کے لیے ایک بدنما داغ ہے۔ ملکی ترقی افراد کی بلند ذہنی سطح پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک بھیک مانگنے والے کی سوچ غلام کی سوچ سے بھی بدتر ہے۔

مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس زمانے میں ہر ایک جگہ جس قدر مسلمان بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، اس قدر کسی اور قوم کے افراد نظر نہیں آتے۔ کاش مسلمان غیرت کو کام میں لائیں اور یہ لوگ اس رسمِ قبیح سے باز آئیں کیونکہ بقول علامہ اقبالؒ:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

۱۶ سیروسیاحت: تفریح بھی، تعلیم بھی

فرمانِ الٰہی ہے: سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ یعنی اس زمین پر گھومو پھرو۔ زمین پر گھومنے پھرنے کا دوسرا نام سیر و سیاحت ہے اور سیر و سیاحت بلا شبہ تفریح بھی ہے اور عمدہ تعلیم کا ذریعہ بھی۔ آدمی گھر سے نکلتا ہے تو اس کے علم میں طرح طرح سے اضافہ ہوتا ہے۔ وہ قسم قسم کے لوگوں سے ملتا ہے۔ اسے اشیا اور جگہوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کی نظروں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ رسولِ کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشاد ہے: اُطْلُبُوا الْعِلْمِ وَلَو کَانَ بِالصِّیْنِ یعنی ''علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین جانا پڑے۔'' آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے یہ ارشاد اس لیے نہیں فرمایا تھا کہ اُس زمانے میں چین میں علم و حکمت کے دریا بہتے تھے اور چار دانگِ عالم سے تشنگانِ علم وہاں آ کر علم کی تشنگی دُور کرتے تھے بلکہ فرمانِ نبوی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا مفہوم یہ تھا کہ چین عرب سے ہزاروں میل دور تھا اور چین تک کے سفر کی تاب لانا بڑا محال تھا۔ اِس سفر میں وسیع سمندری فاصلے طے کرنے کے بعد دشوار گزار پہاڑ بھی آتے تھے، جنگل ویرانے بھی، لق و دق صحرا بھی اور دریا بھی اور ندی نالے بھی، پھر تیز و تند موسم کی سختیاں برداشت کرنا اس کے علاوہ تھا۔ دورِ رسالت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم میں اکیلے دوکیلے شخص کا عازمِ سفر ہونا بھی بعید از قیاس تھا، بلکہ لوگ کارواں در کارواں ایک ملک سے دوسرے ملک کو جاتے تھے اور اثنائے سفر میں مشکلوں کا پیش آنا لازمی امر تھا، جس کی تاب لانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، چناں چہ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان اسی پس منظر میں ہے کہ راستے کی صعوبتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سیر و سیاحت اور علم و فن کے حصول کی افادیت عربوں کے ذہن نشین ہو جائے۔

مَثل مشہور ہے: ''پائے گدا لنگ نیست، ملکِ خدا تنگ نیست'' مفہوم یہ ہے کہ انسان ہمّت کرے تو جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ اللہ کی سرزمین بہت وسیع ہے۔ دنیا میں پانچ بحرِ اعظم اور سات برِّ اعظم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے سیر و سیاحت کی جبلّت کم یا زیادہ ہر شخص کو دی ہے، چناں چہ کچھ لوگوں کو تو بوجوہ گھروں سے نکلنا محال ہوتا ہے مگر کچھ لوگ اپنے سمندِ شوق کو نہیں روک سکتے اور وہ سفر کا سامان تیار کر کے گھروں سے شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں گھومنے پھرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں جن میں سے شاید راقم الحروف بھی ایک ہے۔ زیادہ تر سیاح تو سفر محض اس لیے کرتے ہیں کہ:

اب اپنا بھی میرؔ سا عالم ہے ٹک دیکھ لیا ، دل شاد کیا

مگر کچھ لوگ سیر و سیاحت بڑے اہتمام سے کرتے ہیں، کچھ ''سفر وسیلۂ ظفر'' بنانے کے لیے گھروں سے نکلتے ہیں جب کہ کچھ سیاح دنیا سے کچھ سیکھنے اور سکھانے کا جذبۂ فراواں لے کر دنیا کے دُور دراز گوشوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ انھیں ہر خطۂ زمین کا محض سفر ہی مرغوبِ خاطر نہیں ہوتا بلکہ وہ وہاں کی تہذیب و تمدّن اور معاشرت و معیشت کا بھی غائر مطالعہ کرتے اور اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں سفرنامے بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس حوالے سے قدیم سفرنامہ نگاروں میں البیرونی، ابنِ بطوطہ، مارکو پولو، کولمبس، واسکوڈی گاما اور ناصر الدین شاہ قاچار کے نام خاصے نمایاں ہیں۔

جن لوگوں نے بہ رضا و رغبت اور ذوق و شوق کے ساتھ سفر اختیار کیے وہ ظفر اور فتح مندی سے ضرور بہرہ مند ہوئے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اِس زمانے میں سیر و سیاحت بہت آسان ہے۔ کچھ ملکوں نے تو سیر و سیاحت (Tourism) کو باقاعدہ صنعت کا درجہ دے

رکھا ہے اور سیر وسیاحت کو آسان اور پرکشش بنا دیا ہے، جہاں لوگ جُوق در جُوق جاتے ہیں۔ ان ملکوں میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، سپین، امریکا، آسٹریلیا، چین، جاپان، انڈیا، مصر، سعودی عرب، ترکی، یونان، شام اور ملائیشیا زیادہ اہم ہیں۔ قدرت نے پاکستان کی سرزمین کو بڑی نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہاں گرم پانیوں کا آٹھ سو کلومیٹر طویل ساحل ہے، جس میں سمندری مخلوق کی کثرت ہے، یہاں سربفلک پہاڑوں کے سلسلے ہیں اور دنیا کی گیارہ بلند ترین اور برف پوش چوٹیوں میں سے سات چوٹیاں، جن میں کے ٹو، نانگا پربت اور راکا پوشی شامل ہیں، پاکستان میں ہیں۔ صحت افزا مقامات اور ایسی ایسی سرسبز وشاداب اور گل پوش وادیاں ہیں کہ:

ز فرق تا قدَمَش ہر کُجا کہ من نگرم

کرشمہ دامنِ دل می کَشد کہ جا اینجا ست

یعنی کسی منظر پر نگاہ جا پڑے تو وہاں سے اٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ پاکستان میں ایسے میٹھے اور رسیلے پھل ہیں جو دنیا کے کسی اور ملک میں پیدا نہیں ہوتے علاوہ ازیں بڑی اہمیّت کی حامل تاریخی جگہیں ہیں مگر افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان میں سیر وسیاحت (ٹورازم) کو ابھی تک صنعت کا درجہ نہیں دیا گیا حالانکہ یہ وقت کی اشد ضرورت ہے اور اس صنعت سے خاطر خواہ زرِمبادلہ بھی کمایا جا سکتا ہے۔

۱۷ سیلاب

دُنیا میں انسان پر بے شمار آفات اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ ہر مصیبت ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔ جن میں ایک سیلاب ہے۔ سیلاب کیا ہے؟ سیلاب، ''سیل آب'' کا مرکّب ہے یعنی ''پانی کا طوفان''۔ سیلاب ایک ایسی بلا ہے جس کی تباہ کاری کے ہاتھوں انسانیت سسکنے لگتی ہے۔ بعض دفعہ بارشوں کی وجہ سے دریاؤں اور ندی نالوں میں پانی کی سطح اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ پانی کناروں سے باہر نکل کر دور دور تک پھیل جاتا ہے۔ پانی کے اس تیز ریلے کو جو کناروں سے باہر نکلتا ہے ''سیلاب'' کہتے ہیں۔

پانی دنیا کے چار عناصر میں سے ایک ہے جس پر قابو پانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ بے قابو پانی سے سب پناہ مانگتے ہیں۔ انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات سے بغاوت کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے پانی ہی سے کام لیا۔ ''طوفانِ نوحؑ'' اسی کا نام تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اور اصول ہے کہ وہ انسانوں کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ کون اس کا شکر گزار بندہ ہے اور کون اس کی ناشکری کرتا ہے۔ چناں چہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

''ہم تمھیں کچھ خوف، بھوک، مالوں کی کمی، جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور صابروں کو خوشخبری دے دو۔'' (البقرہ، آیت:۱۵۵)

سیلاب عام طور پر برسات کے موسم میں آتے ہیں کیونکہ اس موسم میں بارشیں مسلسل اور لگاتار ہوتی ہیں۔ ندی نالے بپھر جاتے ہیں، سڑکوں اور گلیوں میں پانی اُبل پڑتا ہے۔ دریا اپنی حدوں کو بڑھا لیتے ہیں۔ مسلسل بارشوں سے پہاڑوں پر جمی برف پگھل کر دریا کے پانی میں شدّت، زور اور بے پناہ وسعت پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے دریا کا پانی کناروں کی حدوں سے باہر نکل کر ارد گرد کے علاقوں تک پہنچنا شروع ہو جاتا ہے۔ دریا کے پانی میں اتنی تیزی ہوتی ہے کہ اس کے راستے کی ہر رکاوٹ تنکے کی طرح اچھل کر ملیامیٹ اور برباد ہو جاتی ہے۔ لوگ بے چارے سیلاب کے آثار دیکھ کر اپنی جانیں بچانے کے لیے دُور کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن کئی افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی

حالت میں مکانوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ نتیجے کے طور پر سیلاب کا پانی موت بن کر انھیں دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔شاید اسی پس منظر میں فراز نے کہا ہے:

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز
کچا تیرا مکان ہے، کچھ تو خیال کر

سیلاب لوگوں سے سر چھپانے کا آسرا چھین لیتا ہے۔ان کو گھروں سے دُور ایسی جگہ جانے پر مجبور کر دیتا ہے جہاں نہ کھانے پینے کی دستیابی ممکن ہے اور نہ سونے کے لیے بستر۔اس افراتفری کے عالم میں بے شمار لوگ سیلاب کی پُرشور اور ہیبت ناک موجوں کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔

سیلاب سے اور بھی بہت سے نقصانات ہوتے ہیں۔مثلاً درخت جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔اس کے ساتھ تیز پانی اپنے ساتھ زرخیز مٹی کو بہا کر لے جاتا ہے اور کہیں دوسری جگہ جا کر ڈھیر کر دیتا ہے۔پودوں کی جڑوں کو کمزور کر دیتا ہے۔فصلوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔بہت سے دیہات اور قصبے شدید سیلاب کے باعث صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ذرائع مواصلات اور بجلی کا نظام بھی تہس نہس ہو کر رہ جاتا ہے۔ زمین کا ایک بڑا حصّہ کٹاؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور یوں بہت سا زرخیز اور زرعی علاقہ دریا بُرد ہو جاتا ہے۔زمین کے کٹاؤ کے عمل سے دریا اپنا رخ بھی بدل لیتے ہیں۔

مصائب کا یہ سلسلہ انھی باتوں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ تیز و تند سیلاب کی وجہ سے بربادی ہی بربادی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ان حفاظتی تدابیر کو اختیار کیا جائے جن کی مدد سے ہم مستقل طور پر اس بڑے نقصان سے بچ سکیں۔ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دریاؤں اور نہروں کی باقاعدہ صفائی کریں تاکہ فالتو مٹی نکلنے کے بعد ان میں زیادہ پانی کے لیے گنجائش پیدا ہو۔ملک میں نئے ڈیم بنائے جائیں تاکہ اس فالتو پانی کو جمع کر لیا جائے اور خشک موسم میں آبپاشی کے لیے استعمال کیا جائے۔لوگوں کو اس مسئلے کے متعلق شعور فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ بہت سی قیمتی جانیں بچ سکیں۔سیلاب آنے کی صورت میں فوراً سدِّ باب کی کوششیں کرنی چاہییں۔لوگوں کی زندگیاں اور ان کی جائیدادیں بروقت امداد سے بچائی جا سکتی ہیں۔حکومت کے اربابِ اختیار کو فوراً متاثرہ لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ان لوگوں تک ضروریاتِ زندگی اور اشیائے خورد و نوش پہنچائی جائیں کیونکہ ایک متاثرہ خاندان کو سنبھلنے کے لیے کافی سال درکار ہوتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کو بھی کئی بار سیلاب کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کو بڑا نقصان پہنچا اور ہزاروں لاکھوں آدمی سیلابوں کی وجہ سے برباد ہوئے۔مثلاً ۱۹۵۰ء میں دریائے راوی اور چناب میں بڑا سیلاب آیا۔۱۹۵۸ء میں جہلم اور چناب میں زبردست طغیانی آئی۔۱۹۷۳ء کا سیلاب شدید تھا جس کی وجہ سے بہت سا مالی اور جانی نقصان ہوا۔دریائے جہلم اور چناب میں ۱۹۹۲ء میں جو سیلاب آیا اس نے تباہی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔اس سیلاب میں اربوں روپے کی فصلیں تباہ ہوئیں اور تقریباً ۳۱۲ لاکھ لوگ سیلاب سے بری طرح متاثر ہوئے۔پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سیلاب ۲۰۲۲ء میں آیا جب خیبر پختونخوا، جنوبی پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے بہت سے علاقوں کو تباہی و بربادی کا جس طرح سامنا کرنا پڑا، ان کے حالات و واقعات بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے۔کیا ان ہلاکت خیز سیلابوں سے بچاؤ ممکن ہے؟ کیا سیلاب کی طوفانی موجوں کا کچھ علاج ہے؟

ہر چند ان باتوں کا جواب نفی میں ہے مگر انسانی تدابیر سے ان کی شدّت کو کسی نہ کسی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔وہ اس طرح کہ تمام دریاؤں کی پہاڑی یا نیم پہاڑی گزرگاہوں پر تربیلا اور منگلا جیسے بڑے بڑے ڈیم بنائے جائیں اور جیسے منھ زور گھوڑے کو لگام دی جاتی ہے

ویسے ہی ان کے پانی کو روک لیا جائے اور اسی پانی سے سیلاب کے بعد آنے والے دنوں میں زمینوں کو سیراب کیا جائے۔

علاوہ ازیں دریاؤں کے کنارے مضبوط پشتے بنائے جائیں اور حکومت دریاؤں اور ندی نالوں کی گزرگاہوں پر تعمیرات کی ہرگز اجازت نہ دے بلکہ یہ دیکھے کہ پانی کی قدرتی گزرگاہ کا راستہ صاف ہے کہ نہیں۔حکومت پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ برسات کے موسم سے قبل ہی ہر سال سیلاب جیسی آفات سے بچنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرے۔

۱۸ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ

کسی بھی ملک کا معاشرہ دیہاتوں اور شہروں سے مل کر وجود میں آتا ہے۔جن ممالک کا زیادہ انحصار زراعت اور فارمنگ پر ہے، ان کی کثیر آبادی دیہات پر مشتمل ہے اور جو ممالک صنعت وحرفت پر بھروسا کرتے ہیں، اُن کی زیادہ آبادی شہروں میں رہتی ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔وہ علیحدہ بات ہے کہ پاکستانی عوام کا رجحان روز بروز صنعت وحرفت کی طرف ہو رہا ہے، مگر ابھی تک زرعی ملک ہونے کے ناتے ملک کی کم وبیش دو تہائی آبادی کا تعلق دیہی علاقوں سے ہے۔ چونکہ دیہات کی نسبت روزمرّہ زندگی کی سہولتیں شہروں میں کہیں زیادہ مُیسّر ہیں، اس لیے ہمارے ملک کے دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ یا تو بڑے شہروں کا رُخ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں یا منصوبے باندھ رہے ہیں۔دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی نے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے، جس سے حکومتِ پاکستان عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کا اپنے قدیم مسکنوں کو چھوڑ کر بڑے شہروں کی جانب رُخ کیوں ہے؟ جب کہ میر انیس نے تو کہا ہے:

دُشمن کو بھی اللہ، چُھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل ، جو بچھڑ جائے چمن سے

تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایسا اپنے دلوں پر جبر کر کے کرتے ہیں کیوں کہ دیہات میں فقط چند ایک ایسے زمیندار گھرانے ہوتے ہیں جن کی زمین زیادہ ہوتی ہے جب کہ اکثریت ایسے مفلوک الحال لوگوں کی ہوتی ہے جن کی اوّل تو زمین نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم۔ دیہات میں انھیں ڈھنگ کا روزگار بھی نہیں ملتا اور ان کی عمر تنگ دستی میں گزرتی ہے۔مزید برآں دیہات میں ان کی اولاد کے لیے تعلیمی اور طبّی سہولتوں کا فقدان ہے، اس لیے وہ قسمت آزمائی کے لیے شہروں کا رخ کرنے پر مجبور ہیں، جہاں ضروریاتِ زندگی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں، اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں بھی وافر ہیں اور اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو اسے بروقت طبّی امداد بھی مل جاتی ہے۔ان کے علاوہ آمد ورفت کی سہولتیں اور ملازمت یا کاروبار کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔ جب کہ شہری زندگی کا تاریک پہلو یہ ہے یہاں کا ماحول دیہات کی طرح پُرسکون نہیں ہوتا اور شہروں کو تازہ ہوا اور خالص غذا بھی میسر نہیں ہوتی جب کہ شہری لوگ روزمرّہ زندگی اور رہن سہن میں تکلّف برتنے اور نمود ونمائش کے عادی ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی ضروریاتِ زندگی بڑھ جاتی ہیں اور یہی چیزیں ان کے سکون کو برباد کر دیتی ہیں، جب کہ دیہات میں انسان فطرت کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔سرسبز وشاداب کھیت، کھلی فضا، ہرے بھرے سایہ دار درخت دیہاتیوں کے لیے قدرت کا عطیہ ہیں اور وہ فطرت کے تقاضوں کے تحت خوشی خوشی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔اس پس منظر میں احسان دانش نے کیا خوب کہا ہے:

واہ رے دیہات کے سادہ تمدّن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار

علاوہ ازیں دیہاتی لوگ عام طور پر ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ملنسار اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔ شہروں کی ہنگامہ خیز زندگی کے موازنے میں دیہات کا ماحول پر سکون ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ سکونِ قلب کی تلاش میں دیہات کا رُخ کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے شاعر احسان دانش کی خواہش ہے کہ:

دل یہ کہتا ہے فراقِ انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں

یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ سائنسی ترقی کے اس زمانے میں دیہات کو بھی ترجیح دی جانے لگی ہے اور دیہات کو شہروں کی مانند بنیادی سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں، جن میں تعلیمی، طبّی اور ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں شامل ہیں۔ اب وہ دن دُور نہیں جب برطانیہ کے علاوہ دیگر یورپی ممالک، امریکا اور آسٹریلیا کی طرح ہمارے ہاں بھی دیہاتی اور شہری زندگی میں خاص فرق باقی نہیں رہے گا۔

۱۹ میری پسندیدہ کتاب

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ہم نشینی اگر کتاب سے ہو
اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں

مطالعۂ کتب ایک ایسا شوق ہے جو ہر صاحبِ علم کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے لیکن مختلف کتابیں تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مطالعہ کے لیے عمرِ نوح علیہ السلام بھی ناکافی ہے، اس لیے لامحالہ ان کتابیں میں سے فقط اپنی پسند اور ذوق کے مطابق انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اب ہر شخص کی پسند اور اس کا ذوق الگ ہے، چناں چہ کتاب کا انتخاب کرتے وقت ایک تو ہمیں اپنی پسند کا لحاظ رکھنا چاہیے اور دوسرے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کتاب کہاں تک مفید اور کس حد تک کارآمد ہے۔ صحیح کتاب کا انتخاب زندگی سنوار سکتا ہے اور غلط کتاب کا انتخاب زندگی برباد کر سکتا ہے۔ اس لیے جس طرح دوستوں کے انتخاب میں احتیاط لازمی ہے، اسی طرح کتابوں کے انتخاب میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

کسی مفکّر کا قول ہے: کچھ کتابیں محض چکھنے کے لیے ہوتی ہیں، کچھ نگلنے کے لیے ہوتی ہیں اور صرف چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں خوب چبا چبا کر ہضم کرنا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اسی قسم کا خیال اپنے ایک لیکچر کے دوران میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''ایسی کتاب صدیوں کے بعد وجود میں آتی ہے جس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔''

قرآن مجید ایک ایسی ہی آفاقی اور دائمی کتاب ہے۔ یہ زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہے۔ یہی میری پسندیدہ کتاب ہے۔ آیندہ سطور میں مجھے یہ واضح کرنا ہے کہ میری پسند کے اسباب کیا ہیں اور یہ کتاب کن موضوعات کی حامل ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی گفت گو حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے ارشادات کی روشنی میں شروع کروں۔ علامہ

اقبالؒ نے امّتِ مسلمہ کو تلقین کی ہے کہ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ اقوامِ عالم میں انھیں عزّت واحترام کی نظروں سے دیکھا جائے تو انھیں چاہیے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں قرآنِ مجید، فُرقانِ حمید سے رہنمائی حاصل کریں اور اپنے کردار کو اس کے مطابق ڈھالیں:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

قرآن مجید کا موضوع انسان ہے۔ قرآن مجید بنی نوعِ انسان کے لیے رُشد وہدایت کا سرچشمہ ہے۔ یہ علم وحکمت کی کتاب ہے۔ اس میں ہر نوع کے فرد اور ہر طرح کی قوم کی اصلاح وفلاح اور تجارت کے لیے رہنما اصول بیان ہوئے ہیں۔ جن پر عمل کر کے عرب قوم، جو نزولِ قرآن سے قبل تہذیب وتمدّن سے ناآشنا تھی، انسانیت کے اعلیٰ وارفع اخلاق سے آراستہ ہوئی اور اُس نے قیصر وکسریٰ کی شہنشاہت کو ختم کر کے بہترین اسلامی معاشرے اور عظیم ترین اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی۔ بقول مولانا حالی:

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا　　پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا　　اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

قرآن مجید سے پہلے نازل ہونے والی کتابیں: تورات، زبور اور انجیل کسی ایک خاص قوم یا ملک کے لیے تھیں لیکن قرآن مجید چونکہ آخری آسمانی کتاب ہے، اس لیے یہ پوری دنیائے انسانیت کے لیے مکمل رشد وہدایت ہے، جس کی تعلیمات ہر دور اور ہر ملک میں قابلِ عمل ہیں۔ اس کتاب کی تعلیمات فطری ہیں، اس لیے ہر دور کا انسان یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے یہ اسی دور کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ خالقِ کائنات کا کلام ہے اور وہ اپنی مخلوق کی ضروریات، تقاضوں اور نفسیات کو سب سے بہتر جانتا ہے۔ تسلیم شدہ امر ہے کہ قرآن مجید سے قبل جو بھی آسمانی کتابیں، جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، نازل ہوئیں، ان کی عبادات میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی حد تک کمی بیشی واقع ہو چکی ہے لیکن ان کے مقابلے میں قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو ڈیڑھ ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں رسول اکرم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے ایک لفظ، ایک حرف بلکہ ایک بھی نقطے میں ذرا بھی فرق نہیں آیا اور ہم پورے وثوق اور اطمینان کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ یہ خالص اللہ کا کلام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہوتا ہے:

(ترجمہ) ''بے شک یہ نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

قرآن مجید فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایک ادبی شاہکار ہے۔ اس میں پہاڑوں کا جلال، سمندروں کا تلاطم، دریاؤں کی روانی، بجلی کی تڑپ اور جواہرات کی مرصع کاری ہے۔ عربوں کو اپنی خطابت اور شعر وشاعری پر بڑا فخر وناز تھا اور وہ اپنے مقابلے میں دوسرے ملکوں کو ہیچ سمجھتے تھے اور انھیں ''عجم''، یعنی گونگا کہہ کر پکارتے تھے لیکن جب قرآن مجید نازل ہوا تو اس کی بے پناہ فصاحت وبلاغت کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں اور کوئی بڑے سے بڑا عالم، خطیب یا شاعر اس جیسا کلام پیش نہ کر سکا۔ قرآن نے جب چیلنج کیا کہ اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر دکھاؤ تو عرب کے تمام فصحا سر جوڑ کر بیٹھے مگر ناکام رہے اور انھوں نے اعتراف کیا کہ بے شائبہ یہ کلامِ الٰہی ہے اور آج تک کوئی شخص اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکا۔ آخر یہ ممکن بھی کیسے ہے؟ قرآن مجید خالقِ کائنات کا کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ مخلوق اپنے خالق کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے؟ روایت ہے کہ جب سورۃ الکوثر نازل ہوئی تو نے اسے لکھ کر خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا گیا۔ عرب کے ایک بڑے شاعر لبید نے

اسے دیکھا تو دریائے حیرت میں گم ہو کر رہ گیا اور وہیں دیوار پر لکھ دیا: ''یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔''

قرآن مجید سے پہلے نازل ہونے والی کتابیں یا تو صرف اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھیں یا صرف مناجات اور دعاؤں یا فقہی مسائل کا مجموعہ تھیں یا اُن میں صرف عقائد یا تاریخی واقعات بیان ہوئے تھے لیکن قرآن مجید ایسی جامع کتاب ہے جس میں ہر انسانی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں اخلاقی تعلیمات بھی ہیں اور عقائد و اعمال کا بیان بھی ہے اور تاریخِ انسانی کے اہم واقعات کا بھی جا بجا تذکرہ ہے۔

قرآن مجید نے انسانیت کو اس کا صحیح مقام بخشا۔ بنی نوعِ انسان کو امن و سلامتی کا پیغام اور حریّت و مساوات کا درس دیا۔ کالے اور گورے، عربی اور عجمی کا فرق مٹا دیا اور حسب و نسب کی بنیاد پر معاشرے میں قائم شدہ امتیازات کو ختم کر کے شرافت اور عظمت کی بنیاد صرف تقویٰ اور خوفِ خدا پر رکھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہ اسی کتاب ہدایت کا اثر ہے، جس نے حضرت عمرؓ کی، جو اپنے باپ (خطاب) کے اونٹ چرایا اور ان کی جھڑکیاں کھایا کرتے تھے، زندگی یکسر بدل کے رکھ دی۔ یہ وہی عمرؓ، ہیں جنھوں نے نہ صرف اسلامی مملکت کو توسیع دی اور اسے مستحکم کیا بلکہ اسلامی سلطنت کا ایسا انتظام و انصرام کیا جو رہتی دنیا تک لوگوں کے لیے عمدہ ترین مثال ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یعنی اگر تم ایک مسلمان کی زندگی جینا چاہتے ہو تو قرآنِ حکیم کو زندگی کا جزو بنائے بغیر ایسا ممکن نہیں۔

۲۰ زلزلے کی تباہ کاریاں

زلزلے کو ہندی میں بھونچال اور انگریزی میں Earth Quake کہتے ہیں۔ ناگہانی طور پر کسی ارضیاتی تبدیلی کی وجہ سے زمین کانپتی ہے تو زلزلہ آ جاتا ہے۔ زمین کا کانپنا کبھی تو اس قدر کم ہوتا ہے کہ زمین کے مکینوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی مگر کبھی کبھی زمین اس زور سے کانپتی ہے کہ عمارتیں لرز کر رہ جاتی ہیں، گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے زور زور سے بجنے لگتے ہیں، شیشے ٹوٹ جاتے ہیں اور بعض اوقات عمارتیں منہدم ہو جاتی ہیں اور عمارتوں کے مکین ملبے تلے دب کر مر جاتے ہیں۔ زمین شق ہو جاتی ہے اور سڑکوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ماہرینِ ارضیات نے ایسی تجربہ گاہیں بنا دی ہیں جہاں زلزلے کی شدّت کی پیمائش ہو جاتی ہے۔ امریکا نے تو اس سلسلے میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطّے میں کیسا ہی زلزلہ کیوں نہ آئے، وہاں اس کی شدّت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اصطلاح میں زلزلے کی پیمائش کو ریکٹر سکیل (Richter Scale) کہا جاتا ہے۔ اگر زلزلہ پانچ ریکٹر سکیل کے لگ بھگ ہے تو شدید ہے۔ پانچ سے ساڑھے چھے ریکٹر سکیل ہے تو شدید تر ہے اور اس سے زیادہ ہے تو شدید ترین اور تباہ کن ہے۔

ماہرینِ ارضیات اب اس بات پر تحقیق کر رہے ہیں کہ زلزلہ آنے کی پیش گوئی کی جا سکے، جس میں وہ تادمِ تحریر تو کامیاب نہیں ہو سکے مگر کچھ بعید نہیں کہ وہ کامیاب ہو جائیں۔

زلزلے کیوں آتے ہیں؟ اس بارے میں جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام برِاعظم مختلف پلیٹوں پر واقع ہیں جو انتہائی گرم سیّال

مادوں پر تیر رہے ہیں۔ان پلیٹوں کے باہمی ٹکراؤ سے جو توانائی پیدا ہوتی ہے، اسی کی لہریں زمین میں ارتعاش پیدا کرتی ہیں، جس کی وجہ سے زمین کانپنے لگتی ہے، جسے زلزلے کا نام دیا جاتا ہے۔

دنیا کے کچھ ممالک ایسے خطّوں میں واقع ہیں، جہاں ارضیاتی طور پر زمین میں ہلچل پیدا ہوتی رہتی ہے۔ان ممالک میں جاپان، میکسیکو، امریکا، اٹلی، ایران، انڈونیشیا اور چین شامل ہیں۔ان ممالک میں زلزلے آتے رہتے ہیں اور یہاں کے لوگ زلزلوں کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے گھر بھی تعمیر کرتے ہیں تو ان کی بنیادیں اتنی مضبوط رکھتے ہیں کہ وہ زلزلے کی صورت میں زمین بوس نہ ہوں، پھر بھی زلزلے متذکرہ ممالک کے علاوہ چند اور ممالک میں بھی کبھی کبھی تباہی و بربادی پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔ ۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے نے پاکستان کے شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں جو قیامت برپا کی، اُس کا تصّور کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اس زلزلے نے مظفر آباد، بالاکوٹ، باغ، مانسہرہ، راولاکوٹ اور گردونواح کے علاوہ ایک وسیع وعریض سرزمین کو تباہ و برباد کر دیا، پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گئے، چٹانیں ٹوٹ پھوٹ گئیں، ندی نالوں کے رُخ بدل گئے، بشمول عطا آباد کئی نئی جھیلیں بن گئیں، عمارتیں زمین پر آ رہیں، اسّی ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے، لاکھوں معذور ہو گئے اور جو مالی ضرر پہنچا، اس کا شمار محال ہے۔اس زلزلے سے چند سال پہلے جاپان کے شہر کوبے، ہندوستان کے شہر احمد آباد اور ایران کے قدیم شہر بام میں انتہائی خوفناک زلزلے آئے۔قیامِ پاکستان سے پہلے ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے شدید ترین زلزلے سے پورا شہر برباد ہو گیا تھا اور پچاس ہزار سے زیادہ افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔اکتوبر ۲۰۱۵ء میں بھی شمالی پنجاب اور خیبر پختونخوا میں شدید زلزلہ آیا جس کی شدّت ریکٹر سکیل پر ۳.۷ تھی۔اس زلزلے نے بھی بعض شمالی علاقوں میں بڑی تباہی مچائی اور سیکڑوں لوگ مارے گئے اور ہزاروں بری طرح متاثر ہوئے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ زلزلوں کو کسی ریکٹر سکیل پر نہیں بلکہ غیرت وحمیّت اور شرم وحیا کے پیمانے سے ناپنے کی ضرورت ہے کیوں کہ زلزلہ کسی زیرِ زمین کا نہیں بلکہ بالائے زمین انتشار کا نتیجہ ہے اور قہار و جبّار قادرِ مطلق کا انتقام ہے اور اُن انسانوں کے لیے ایک طرح کی وارننگ ہے جو خدا کی زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔

اس موقع پر زلزلے کے حوالے سے ہندوؤں کے اس دل چسپ مگر مضحکہ خیز عقیدے کا ذکر کرنا بے محل نہیں، جس کے مطابق ''زمین گائے'' نے زمین کو اپنے ایک سینگ پر ٹِکا رکھا ہے جب اس کا وہ سینگ بوجھ کے مارے تھک جاتا ہے تو گائے زمین کو دوسرے سینگ پر منتقل کر لیتی ہے جس کے سبب زلزلہ آتا ہے اور جہاں تک اردو شعری ادب کا تعلق ہے تو کسی شاعر نے زلزلے کی کیا خوب صورت توضیح کی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

بے سبب زلزلہ عالم میں نہیں آتا ہے
کوئی بے تاب تہِ خاک تڑپتا ہو گا

۲۱ تمباکو نوشی کے نقصانات

اردو کے عظیم مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سگریٹ ایک ایسا بدبودار مادہ ہے جس کے ایک سرے پر آگ اور دوسرے سرے پر احمق ہوتا ہے۔''

تمباکو نوشی ہمارے معاشرے کی ایک ایسی قبیح عادت ہے جس میں قوم کا ہر دوسرا فرد مبتلا ہے۔ان میں کوئی حُقّے کا عادی ہے، کسی کو سِگار

کی لت ہے توکسی نے سگریٹ کا شوق پال رکھا ہے۔ یہ سارے کے سارے بے کار مشغلے اور بے ہودہ شوق ہیں جن سے پیسے اور صحت کے زیاں کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک سروے کے مطابق ہمارے نوجوان طلبہ وطالبات محض فیشن ہی فیشن میں سگریٹ نوشی کا آغاز کر دیتے ہیں جو بعد میں ان کے لیے مالی مسائل کے ساتھ ساتھ بے شمار طبی مسائل کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ بعض اوقات کئی نوجوان سگریٹ کے کثرتِ استعمال (Chain Smoking) سے نوجوانی میں ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

یہ جو سگریٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تمام منشیات کی ماں ہے۔ تو یہ درست ہے کیونکہ تقریباً ہر نشے کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ پہلے پہل مذاق یا شرارت کے رنگ میں ہلکی پھلکی تفریح یا دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے اس کا آغاز ہوتا ہے، رفتہ رفتہ یہ زندگی کے گھمبیر مسائل کا سبب بنتی چلی جاتی ہے۔ نئی تحقیق کے مطابق معدے اور سانس کی بیشتر بیماریوں کا سبب تمباکو نوشی ہے۔ اس کی عادت پختہ ہو جائے تو تپ دق اور مُنھ کے کینسر جیسی موذی بیماریاں بھی لاحق ہو سکتی ہیں۔ دل کی زیادہ تر بیماریاں بھی تمباکو نوشی کی وجہ سے لگتی ہیں اور یہ ہونٹوں اور دانتوں کی بدصورتی کا سبب بھی بنتی ہے، جس سے انسان کی ظاہری شخصیت کو بھی بے حد نقصان پہنچتا ہے۔

ہمارے یہاں دیہات میں بالعموم حقے کو ہاضمہ کے مسائل حل کرنے کا سبب سمجھا جاتا ہے جس کی حمایت میں کسی حکیم یا دانا کے قول کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کسی زمانے میں کسی مخصوص مرض کے پیشِ نظر کسی حکیم نے کسی خاص مریض کو حُقّہ کشی کا مشورہ دیا ہو مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حُقّے کو ہر طرح کا مریض ہر وقت اور ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر استعمال کرنا شروع کر دے۔

کہا جاتا ہے کہ سگریٹ اور حُقّے کا ہر کش زندگی کے چند ثانیے کم کرتا چلا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس کا جواب: ''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے'' کہہ کر دیتے ہیں۔ وہ اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اسی خدائے بزرگ و برتر نے زندگی اور صحت جیسی نادرو نایاب نعمتوں کی حفاظت کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔

علامہ اقبالؒ، جو ہمارے قومی شاعر ہیں اور ان کی دانش وحکمت کو پوری دنیا میں چرچا ہے، کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ حُقّے کے بہت شوقین تھے بلکہ حُقّہ پینا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان کے ملازم علی بخش کا بیان ہے کہ حُقّہ تازہ کرنے اور چلم بھرنے کی ذمّہ داری میری تھی علامہ اقبالؒ نہ صرف خود حُقّہ پیتے تھے بلکہ اپنے اُن احباب کو بھی پیش کرتے تھے جو حُقّے کے رسیا تھے۔ بعد میں یہ مشغلہ ان کی موت کا سبب بن گیا۔ حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، جو ایک طویل عرصے سے کینیڈا میں مقیم ہیں اور ایک دانش ور اور ادب شناس ہونے کے ساتھ ساتھ کینیڈا کے معروف ماہرِ قلب بھی ہیں اور علامہ اقبالؒ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، دنیا بھر کی بڑی بڑی جامعات میں فکرِ اقبال کے حوالے سے لیکچر دیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ پر متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''چوں مرگ آید'' شائع ہوئی ہے، جس میں علامہ اقبالؒ کی تمام بیماریوں اور موت کا سبب بننے والے امراض پر طبّی اور سائنسی انداز سے تحقیق کی گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کی جملہ امراض کا موجب تمباکو نوشی تھا اور اگر وہ محض حُقّے سے پرہیز کر لیتے تو مزید بیس برس تک ان کی صحت اور زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا تھا۔

مولانا ظفر علی خاںؒ اور علامہ اقبالؒ کا زمانہ ایک ہے۔ دونوں قریبی دوست تھے۔ دونوں نے اپنے اشعار کے ذریعے سے قوم میں آزادی وحریت کا جذبہ پیدا کیا۔ شعر بہت جلد کہنے پر قادر اور شعلہ بیان مقرّر تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے ان کے بارے میں یکم مئی ۱۹۳۶ء کو بادشاہی مسجد لاہور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''مجھے اپنے صوبے میں مولانا ظفر علی خاںؒ جیسے دو چار آدمی دے دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، پھر مسلمانوں کو کوئی شکست

نہیں دے سکتا۔''

مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بھی حُقّے کے بہت رسیا تھے۔ ان کی عادت تھی کہ حُقّے کا ایک لمبا کش لگاتے اور ایک شعر کہہ دیتے۔ شاید اسی پس منظر میں ان کا ایک شعر ہے:

حُقّہ پیتا ہے، شعر کہتا ہے
اور عاشق میں کیا برائی ہے

ہر چند مولانا ظفر علی خاں نے خاصی عمر پائی مگر شاید وہ تمبا کو نوشی نہ کرتے ہوتے تو ملک وملّت کی خدمت کے لیے دس بیس سال اور جیتے۔

پروفیسر ڈاکٹر سجاد باقر رضوی انگریزی اور اردو کے معروف استاد تھے۔ وہ سگریٹ اور سگار بے تحاشا پیتے تھے۔ اس لیے انھیں دمے کا مرض لاحق ہو گیا اور انھیں کھانسی کے دورے پڑنے لگے۔ موت سے چند دن پہلے جب ڈاکٹر نے ان کے پھیپھڑوں کا ایکسرے کیا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں کا صرف ایک انچ حِصّہ ایسا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں ورنہ تمام پھیپھڑا سگریٹ نوشی کی وجہ سے پرانی روئی (لوگڑ) کی مانند ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے چند دنوں بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اے کاش! وہ سگریٹ سگار نہ پیتے ہوتے تو کچھ دن اور جیے ہوتے اور اپنے علم و فضل سے اپنے شاگردوں کو فیض یاب کرتے۔

تمبا کو نوشی سے انسانی صحت کو جو نقصانات پہنچتے ہیں، ان کا احاطہ کرنا بڑا مشکل ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ دل اور سانس کی اکثر بیماریاں، منھ اور مسوڑھوں کے زیادہ تر امراض، جوڑوں کے درد اور دیگر کچھ مہلک امراض اس کا لازمی شاخسانہ ہیں، جس سے انسان اپنی طبعی عمر میں، جو وہ قدرتِ کاملہ کی طرف سے لے کر آتا ہے، دس سے بیس سال کی کمی کر لیتا ہے۔

اس ساری بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صحت اور زندگی اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتوں میں سے ہیں۔ انھیں تمبا کو نوشی کے ذریعے سے نقصان پہنچانا کفرانِ نعمت کے زُمرے میں آتا ہے۔ اگر آپ تمبا کو نوشی سے بچے ہوئے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کریں اور کسی وجہ سے اس میں مبتلا ہو چکے ہیں تو محض قوتِ ارادی سے اسے ترک کیا جا سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی طرف سے تھوڑی سی غفلت یا سستی کل کو کسی بڑے پچھتاوے کا سبب بن جائے۔ بقول صوفی تبسّم:

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لادوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو